ڈاکٹر سردار احمد خان

سید محمد میر سوز اور میر تقی میر

اپنی خود نوشت 'ذکر میر' میں میر تقی میر نے اپنے حالات زندگی اور دیگر واقعات قلم بند کئے ہیں۔ انھوں نے نزاعی یا اختلافی واقعات جو بھی لکھے ہیں ان کی صحت کو جانچنے کے لیے ہمارے پاس کوئی دستاویز نہیں ہے۔ جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ یک طرفہ ہے۔ ایسی صورت میں ان کے بیانات کی صداقت کو تاریخی، معاشی، معاشرتی اور نفسیاتی اصولوں کی کسوٹی پر جانچنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میر تقی میر لکھتے ہیں کہ جب ان کے والد کا آخری وقت آ پہنچا تو انھوں نے اپنے بڑے صاحبزادے حافظ محمد حسن جو سراج الدین علی خان آرزو کے حقیقی بھانجے اور میر تقی میر

کے سوتیلے بھائی تھے کو کتابوں کی بطور وراثت تقسیم کرنے کے لیے کہا تو انھوں نے یہ عذر پیش کیا کہ میر کتابوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے ہیں ان کے ورق پھاڑیں گے اور پتنگ بنائیں گے۔ حافظ محمد حسن کے اس جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ میر تقی میر اپنے والد کی وفات تک کھیل کود اور پتنگ بازی میں غیر ذمہ دارانہ طور سے زندگی گذار رہے تھے۔ پتنگ بازی کا خاص طور سے ذکر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ میر کا محبوب مشغلہ تھا جب کہ حافظ محمد حسن باپ کی حیات میں حفظ قرآن کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ میر تقی میر نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے والد نے حافظ محمد حسن کی بجائے اپنے کفن دفن کی ذمہ داری میر تقی میر کو سونپی اور قرض بے باق کرنے کی وصیت کی۔ حافظ محمد حسن ان کے سگے بڑے بیٹے تھے اور میر تقی میر سے سن رسیدہ بھی تھے یہ کیسے مان لیا جائے کہ ان کے ہوتے ہوئے کفن دفن اور مالی امور کی ذمہ داری میر کو دی گئی ہو جن کی عمر ابھی سترہ سال کی بھی نہ تھی۔ (۱)

والد کے مرنے کے بعد میر تقی میر کی نگہداشت حافظ محمد حسن نے کی ہوگی جس کو وہ اپنی تندخوئی کی وجہ سے برداشت نہ کر سکے ہوں گے لہٰذا یا تو حافظ محمد حسن نے ان کو گھر سے بے دخل کر دیا ہوگا۔ یا میر اپنی خودسری کے باعث اپنے چھوٹے بھائی محمد رضی کو آگرہ چھوڑ کر دہلی جا پہنچے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ حافظ محمد حسن اس کے کفیل رہے ہوں گے لیکن میر نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ دہلی میں وہ کہاں رہے یہ انھوں نے نہیں بتایا۔ البتہ نواب امیر الامراء صمصام الدولہ کی سرکار سے ایک روپیہ روز کے وظیفہ کا ذکر کیا ہے۔ نادر شاہ کی غارت گری میں نواب موصوف کے مارے جانے کے بعد یہ وظیفہ بند ہوگیا۔ یہ معلوم نہیں کہ وظیفہ ملنے کے بعد وہ دہلی میں رہے یا اکبرآباد ہی میں رہے۔ اغلب یہ ہے کہ وہ وظیفہ اکبرآباد میں لیتے رہے جب نادری ہنگامہ فرو ہوا تو وہ ۱۸ صفر ۱۱۵۲ھ/۱۶ مئی ۱۷۳۹ء کے بعد دوبارہ دہلی آئے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہے اس سے یہ بات ظاہر ہوجاتی ہے کہ پہلی بار بھی سراج الدین علی خان آرزو کے پاس رہے ہوں گے کیونکہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا

(۱) ذکر میر مرتبہ مولوی عبدالحق انجمن اردو پریس اورنگ آباد ۱۹۲۸ صفحہ ۵۷۔۶۰

ہے کہ میر اپنے والد کی وفات کے بعد سترہ سال کی عمر میں دہلی گئے اور سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس رہے اور ان سے علوم عقلی و نقلی کی تحصیل کی دوسری بار آئے ہوں گے تو بھی خاں آرزو کے پاس ٹھہرے ہوں گے اور منقطع تعلیم کا سلسلہ شروع کر دیا ہوگا۔

میر تقی میر نے مثنوی ''جوش عشق'' میں لکھا ہے کہ ان کی کسی لڑکی سے ''آنکھ لڑی'' ہوئی تھی جب ان کو سفر درپیش ہوا جو یقیناً دہلی کا سفر تھا وہ اپنے محبوب سے رخصت ہونے کے لئے گئے اور اس غم زدہ کو ملاقات کر کے اور غمزدہ کیا اور وقت رخصت ایک قیامت گذر گئی۔

کر ٹک دل کا راز نہانی ثبت جریدہ میری زبانی
یعنی میر اک خستہ غم تھا سر تا پا اندوہ و الم تھا
آنکھ لڑی اس کی اک جاگہ بے خود ہوگئی جان آگہ
بارے سفر کا مائل ہو کر حب وطن کو جی سے دھو کر
رخصت کو اس پاس بھی آیا جلتے کے تئیں اور جلایا
وقت وداع قیامت گذرا سر سے آب حسرت گذرا

اس معاشقہ کی بابت احمد حسین سحر نے اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''مشہور است کہ بہ شہر خویش، با پری تمثالے کہ عزیز آنش بود در پردہ تعشق طبع و میل خاطر داشتہ۔ آخر عشق او خاصیت مشک پیدا کردہ۔ می خواست کہ نجیبہ چار سوئے رسوائی بہ کندو حسن بے پردہ بہ جلوہ گری درآید۔ از ننگ راز وطعن اقرباء بادلے در بغل پروردۂ حسرت و باخاطر ناشاد دردست وگریباں قطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ برانداز یہابہ شہر لکھنو رسید''

تذکرہ نگار احمد حسن سحر نے یہ غلط لکھا ہے کہ میر لکھنو چلے گئے لکھنو میں تو وہ اس وقت گئے جب ان کی عمر ساٹھ سال سے اوپر تھی۔ یہ میر کی سترہ سال کی عمر کا پہلا عشق تھا جس میں مبتلا ہو کر وہ پہلی بار دہلی گئے۔ نادر شاہ کی غارت گری کے بعد میر دوسری بار جب دہلی واپس گئے تو وہاں کسی اور رہزن تمکین وہوش نے ان کا ''دل ٹھگا''۔

ایک صاحب سے دل لگا میرا　　ان کے عشووں نے ''دل ٹھگا'' میرا
ابتدا میں تو یہ رہی صحبت　　نام سے ان کے تھی مجھے الفت
چپکے منہ ان کا دیکھ لیتا تھا　　جی میں کیا تھا یہ کچھ نہ کہتا تھا
وے تو ہر چند اپنے طور کے تھے　　پر تصرف میں ایک اور کے تھے
بات کی طرز میری ہی بھاتی　　میری آزردگی نہ خوش آتی
پیار چتوں سے پھر نکلنے لگا　　دیکھنا دل کو میرے ملنے لگا
کچھ کچھ آزار مجھ کو دینے لگے　　قسم اقسام مجھ سے لینے لگے
دیکھ کر روتا آپ بھی روتے　　دل دہی کرتے جب تلک سوتے
کیا کہوں کیسا قد بالا ہے　　قالب آرزو میں ڈھالا ہے
ایک دن فرش پر تھا میر ا ہاتھ　　باتیں کرتے تھے وے بھی میرے ساتھ
پاؤں سے ایک انگلی مل ڈالی　　لطف سے درد وہ نہ تھا خالی
درد سے کی جو میں نے بے تابی　　دست نازک سے دیر تک دابی
دوستی' رابطہ' وفا' اخلاص　　ساتھ میرے تھا ان کو رابطہ خاص
برسوں تک میں پھرا ہوں سرگرداں　　روز و شب دونوں تھے مجھے یکساں
گئی برباد عزت ان کی لیے　　جلفِ لوگوں نے منہ پہ طعنے دیے

میؔر کے کاروبار عاشقی کے تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اکبرآباد ہی میں اپنے خاندان کی کسی عفت مآب سے ان کی ''آنکھ لڑی'' اور ان ''پراگندہ روزی'' کا دوسری بار دہلی میں ''دل ٹھگا'' گیا۔ مندرجہ بالا اشعار کا جائزہ لینے سے یہ کہانی وجود میں آتی ہے کہ میر کسی واقف کار کے مکان پر رہائش پذیر تھے۔ وہاں صاحب خانہ کی کسی کم عمر لڑکی کو آتے جاتے' دیکھتے بھالتے ان کا دل اس کی طرف مائل ہوگیا شروع میں اس کے نام میں کشش محسوس ہوئی۔ صرف اس کی جھلک دیکھ لیتے تھے دل کی حالت کو بیان کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ

لڑکی آزاد اور اپنے من کی مالک نہ تھی۔ یہاں پر میر نے ''تصرف'' کا جو لفظ استعمال کیا جو محل نظر ہے۔ تصرف کے معنی قبضہ میں اور زیر استعمال ہونے کے ہیں۔ اگر یہ معنی لیے جائیں تو گویا میؔر کسی کی منکوحہ پر نظر بدر رکھتے تھے۔ اگلا شعر اس خیال کی تصدیق کرتا ہے کہ دوسرے کے تصرف میں ہونے کے باوجود میؔر ہی کی طرف ملتفت تھی۔ لفظ کے غلط استعمال سے قطع نظر ماہرین نفسیات و جنسیات اس مسئلہ پر متفق ہیں کہ بڑھتی ہوئی عمر میں ایک ایسا مقام آتا ہے جب مخفی احساسات ابھرنے لگتے ہیں۔ یہ عمل صنف نازک میں تیرہ چودہ سال کی عمر میں پختہ ہو جاتا ہے۔ صنف قوی میں چودھا پندرہ سال کی عمر سے جاگ جاتا ہے۔ میر تقی میؔر کے بقول ان کے والد نے اوائل عمری ہی سے ان کو عشق کی تلقین کی ہر چند ان کا مطلب عشق حقیقی اور معرفت الٰہی سے تھا لیکن میؔر شباب میں قدم رکھتے ہی جنسی عشق والے احساسات کی زد میں آ گئے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ لڑکوں کا پندرہ سال کی عمر سے لے کر بیس بائیس سال کا زمانہ بہت ہیجان انگیز اور پرشور ہوتا ہے جبکہ عقل اور شعور میں اس نسبت سے پختگی پیدا نہیں ہو پاتی ہے جس کے باعث بقول میر لڑکے ''آنکھ لڑاتے ہیں'' اور لڑکیاں ''دل ٹھگ لیتی ہیں'' خاص طور سے جب مناسب تربیت نہ ملی ہو۔ خاندانی پس منظر روشن اور فراخ نہ ہو مزید برآں مزاج میں تند خوئی، بدعقلی اور بے راہ روی بھی داخل ہو۔ برملا اظہار عشق اور دیوانہ پن اختیار کر کے عزیز و اقارب کو مجبور کر دیا جاتا ہے کہ وہ بدنامی سے بچنے کے لیے مطالبات کے آگے سر جھکا دیں، یہاں پر صنف نازک کی خوبی کہی جائے یا خامی یہ نفسیاتی رجحان اس کی سرشت میں داخل ہے کہ اگر کوئی غیر شادی شدہ ہم عمر مرد اس کے آس پاس ہوتا ہے تو اس کو یکہ و تنہا اور بے سہارا ہونے پر اسے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر ایک انس کا جذبہ دامن گیر ہوتا ہے جس کو میؔر نے اس طرح کہا ہے، ''پیار چتوں سے پھر نکلنے لگا'' اچانک ماضی کی باتیں سناتے سناتے میر اپنے دلنواز کا موجودہ سراپا یوں بیان کرتے ہیں۔

کیا کہوں کیسا قدِ بالا ہے　　قالب آرزو مین ڈھالا ہے

جس سے بات کی تہہ تک پہنچ جانے والوں نے یوں کہا کہ میرؔ جب اکبرآباد سے دہلی دوسری بار آئے تو انھوں نے سراج الدین علی خاں آرزو کی صاحبزادی سے راہ و رسم بڑھانے کی کوشش کی۔ میر تقی میرؔ کے ''آنکھ لڑنے'' کے راز اکبرآباد میں بھی کھلے اور دہلی کی انتہائی معزز، معروف و مشہور تعلیم یافتہ ہستی کے اعتماد کو دھچکا لگا۔ حافظ محمد حسن اور سراج الدین علی خاں آرزو کے درمیان خاندانی مسائل پر مراسلت ہوئی۔ اس دور میں مذہبی اور معاشرتی آداب کا پاس کیا جاتا تھا اس قسم کی حرکتیں ناقابل معافی جرم سمجھی جاتی تھیں۔ ماحول کو سازگار بنانے اور اپنی مقصد براری کی خاطر دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ''مجنوں'' کا جو بہروپ میرؔ نے بھرا تھا اس پر حافظ محمد حسن کو میرؔ کے لیے ''فتنہ روزگار'' لکھنا پڑا۔

مذہب عشق میں طالب و مطلوب کی سرگوشیاں دلوں میں جاگزیں ہونا مستحسن۔ عشاق کی آشفتہ مزاجی قبول لیکن پیکر حسن کی معصوم محبت کو برسرِ عام رسوا کرنا میر تقی میر کا شیوہ عاشقی ہے۔ اپنی نام نہاد عزت جانے کا غم ہے لیکن محبوب کو حیا سوز انداز سے بدنام کرنے کا احساس بھی نہیں، حالانکہ وہ خود کہتے ہیں کہ ان کے اس نازیبا طریقہ عمل پر ان سے کم تر اور ادنیٰ افراد نے ان پر نفرین کی اور طعنے دیئے۔ میر کو اپنے عمل پر کوئی پشیمانی نہیں بلکہ شکایت اپنے محسنوں سے ہے۔ سراج الدین علی خاں آرزو اور حافظ محمد حسن کے بارے میں لکھتے ہیں:

''چندے پیش او ماندم و کتابے چند از یاران شہر خواندم چوں قابل این شدم کہ مخاطب صحیح کسے می توانم شد۔ نوشتہ اخوان پناہ رسید کہ میر محمد تقی فتنہ روزگار است۔ زنہار۔ بہ تربیت او نہ باید پرداخت و در پردہ دوستی کارش باید ساخت۔ آں عزیز دنیا دار واقعی بود نظر بر خصومت ہمشیرہ زادۂ خود بر من کشید۔ چہ گویم چہ حالت کشیدم۔ ہر چند پنبہ دہانی اختیار می کردم او از دستِ نہ می داشت باصد احتیاج یک روپیہ از او نہ می خواستم اما سلاخی نہ می گزاشت۔ خصمی او اگر بہ تفصیل بیان کردہ آید۔ دفترے جداگانہ می باید۔ خاطر گرفتہ من گرفتہ تر شد۔

سراج الدین علی خاں آرزو کے گھر سے بے دخل ہونے کے بعد ان کا علاج الدین خان کی بیوی نے جو میر کی عزیز اور ان کے والد کی مرید تھیں کرایا لیکن جب ''فصد کھلی تو مجنونیت بالکل جاتی رہی''۔

لگے نشتر ایسے کہ لگتے نہیں چھبے جیسے مژگاں کسو کے تئیں
لگی جان سی آنے اعضا کے بیچ کوئی روز رہنا تھا دنیا کے بیچ
دکھایا نہ اس مہ نے رو خواب میں نہ دیکھا پھر اس کو کبھی خواب میں

شاید میر سردی کے موسم میں دیوانے ہوئے اور گرمیوں میں ٹھیک ہوگئے۔ میر کی دیوانگی خاندانی بیماری بھی ہوسکتی ہے کیونکہ بقول میرؔ ان کے چچا بھی خلل دماغ کے عارضہ میں فوت ہوئے تھے۔ [۲] اگر ان کی آشفتہ سری عشق کا شاخسانہ ہے تو یہ بھی کوئی بعید از قیاس نہیں۔ اس زمانے کے عاشق کچھ زیادہ ہی حساس اور جذباتی ہوتے تھے جیسا میر سوز کے فرزند میر مہدی داغؔ کا انجام ہوا۔

میر کی جنونی کیفیت مختصر رہی اور ''نشتر زنی'' ہوتے ہی جاتی رہی لہٰذا گمان یہی ہوتا ہے کہ ان کی شوریدہ سری خود اختیاری تھی کیونکہ اس کے بعد ان پر خبط الحواسی کا دورہ پھر کبھی نہیں پڑا۔ وہ نواب امیر خاں انجامؔ کے کارگذاروں میں شامل ہوگئے اور ان ہی کی حویلی میں اقامت اختیار کر لی۔

یہ تمام واقعات میر کے دوبارہ دہلی آنے (۱۱۵۲ھ/۱۷۳۹ء) سے لے کر نواب امیر خاں انجامؔ کے قتل [۳] (۱۱۵۹ھ/۱۷۴۶ء) تک کے ہیں اس وقت ان کی عمر تیئیس سال کی تھی وہ سراج الدین علی خان آرزو کے دامن فیض سے مستقلاً ساتھ آٹھ سال وابستہ رہے۔ میر کا یہ کہنا کہ جب حافظ محمد حسن نے دیکھا کہ میر علمی لحاظ سے کچھ ترقی کر رہے ہیں تو انھوں نے بغض اور حسد کے باعث سراج الدین علی خاں آرزو کو سرپرستی سے ہاتھ اٹھا لینے کے لیے لکھا

(۲) ذکر میر صفحہ ۴۰۴
(۳) محمد شاہ کے عہد میں ہفت ہزاری کے منصب پر فائز تھے۔ ایک درباری سازش کا شکار ہو کر اپنے ہی غلام کے ہاتھوں لال قلعہ میں قتل ہوئے۔

سراسر غلط ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ سات آٹھ سال اپنے ماموں کے پاس ان کی پرورش نہ ہونے دیتے۔ میرؔ کی یہ بھی احسان فراموشی ہے کہ رہے وہ سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس اور کہتے یہ ہیں کہ 'کتابے چند از یارانِ شہر خواندم' کیا اس وقت خاں آرزوؔ سے زیادہ صاحب علم وفضل شہر دہلی میں کوئی اور بھی تھا؟ میر کا ظرف اور خاں آرزوؔ کی سیر چشمی ان کے تذکرہ مجمع النفائس کے اس ترجمہ سے ظاہر ہوتی ہے جو میر کے بارے میں ہے۔

''میر محمد تقی المتخلص بہ میرؔ۔ دراول بہ مشق اشعار ریختہ کہ بہ زبان اردو شعر یست بہ طرز شعر فارسی توغل بسیار نمودہ۔ چنانچہ شہرہ آفاق است وبعد آں بہ گفتن اشعار فارسی بہ طرز خاص گردیدہ، قبول خاطر ارباب سخن ودانایاں این فن گشت، طبعش بہ مضامین تازہ وغیر مبتذل معنی پرداز است واشعار بہ لطافتِ اداوانداز از بسکہ ذہن مناسب وطبع ثاقب یافتہ درابتدائے مشق شعر رتبہ سخن رابہ پایہ انتہار سانید۔ ہر چند میرؔ دیوان مختصر دارداماؔ غزلہائے دردمندانہ عاشقانہ می گوید۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ میر تقی میر کا سراج الدین علی خاں آرزوؔ سے کوئی خونی رشتہ نہ تھا بجز اس کے کہ وہ ان کے سگے بھانجے کے ایک اعتبار سے سوتیلے بھائی تھے رشتہ کی اس تہمت کے باوجود سراج الدین علی خاں آرزوؔ نے اقربا پروری میں بخل سے کام نہیں لیا۔ ان کی تعلیم وتربیت میں سعی کی اور برائے نام رشتہ کو اس طرح نباہا کہ ہر تذکرہ نگار نے میر کو ان کا پروردہ اور ہمشیرزادہ لکھا ہے۔ سید فتح علی گردیزی واضح طور پر لکھتے ہیں (۴) ''شمع استعدادش برکردۂ شعلہ ادارک سراج الدین علی خاں آرزوؔ است'' اسی طرح مرداں علی خاں مبتلا لکھنوی (۵)۔ میر علاء الدولہ اشرف علی خاں (۶)۔ قدرت اللہ خاں شوقؔ رام پوری (۷) شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ (۸)۔ شیخ وجیہ الدین عشقیؔ (۹)۔ مرزا علی لطفؔ (۱۰)۔ بھگوان داس

(۴) تذکرہ ریختہ گویاں۔ صفحہ ۱۳۷
(۵) گلشن سخن۔ صفحہ ۲۰۵
(۶) تذکرہ الشعراء صفحہ ۲۶۶۔
(۷) تکملۃ الشعراء (قلمی) صفحہ۔ ۲۸۸ بحوالہ نقوش میر نمبر صفحہ ۹۱
(۸) عقد ثریا صفحہ۔ ۵۳۔۵۴
(۹) تذکرہ عشقی (دو تذکرہ) صفحہ۔ ۱۹
(۱۰) گلشن ہند صفحہ۔ ۵۲۔۱۵۳

ہندیؔ (۱۱)۔ میر محمد خان بہادر سرور (۱۲)۔ شیخ احمد سندیلوی (۱۳)۔ منشی احمد حسین سحرؔ (۱۴)۔ منشی کریم الدین (۱۵)۔ نصر اللہ خاں خویشگی (۱۶)۔ سید علی حسن (۱۷)۔ مولوی عبدالغفور نساخؔ (۱۸)۔ مرزا کلب حسین نادرؔ (۱۹)۔ نے خصوصیت کے ساتھ ہمشیرزادہ سراج الدین علی خاں آرزو لکھا ہے۔ شیخ وجیہ الدین عشقی۔ کلب حسین خاں نادر اور سید علی حسن نے ہمشیرزادہ کے ساتھ تربیت کردہ اور شاگرد سراج الدین علی خاں آرزو بھی لکھا ہے۔ مرزا علی لطف نے رشتہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے ''سراج الدین علی خاں آرزو آپ کے کچھ رشتہ داروں میں دور کے تھے۔''

ابوالحسن امیر الدین احمد امر اللہ الہ آبادی تذکرہ نگاری کے عام روائیتی انداز سے ہٹ کر مکمل سیاق وسباق کے ساتھ لکھتے ہیں ''اماؔ قدر وقیمتش در بازار دہلی افروز دو مشق سخن بخدمت سراج الدین علی خاں آرزو کردہ۔ شاید باوے قرابت خواہرزادگی دارد۔ بہ سبب رعونت و گردن کشی کہ خلق اوست زباں زدزباں آور آن شدہ و باعث عیب جوئی سخنوراں درزباں شاں افتاد۔ بقول شخصے۔

عیب مردم فاش کردن بدترین عیب ہا عیب جو اول کند بے پردہ عیب خویش را
ہر یکے راحوصلہ عیب جوئی او بہم رسید۔ مرزا رفیع گوید۔

ہر ورق پر ہے میر کے اصلاح لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے

تذکرہ نکات الشعراء تالیفِ اوست۔ درآں عجب نکتہ چینی درکلامِ شعرائے ریختہ نمودہ بہ تحقیر وبے ادائی آوردہ۔ اشعار ایشاں رابے رتبہ و ناپسندیدہ چیدیدہ ذکر کردہ۔ اگر راست گویم سبب تالیف ایں تذکرہ مسرت افزا ہمیں بود کہ من بہ زعم حاسداں عیب بیں وخردہ گیران نکتہ چیں حالات ہر یکے کماہی در مسطر تحریر کشیدم لیکن چوں دراین غربت دیوان احدے

(۱۱) سفینہ ہندی صفحہ۔ ۲۰۵ بحوالہ نقوش میر نمبر۔ صفحہ ۹۵
(۱۲) عمدۃ المنتخبہ صفحہ۔ ۵۳۔۵۵۴
(۱۳) مخزن الغرائب بحوالہ نقوش میر نمبر صفحہ۔ ۹۶
(۱۴) تذکرہ بہار بے خزاں صفحہ ۹۵
(۱۵) طبقات الشعراء ہند صفحہ۔ ۱۵۔۱۱۶
(۱۶) گلشن ہمیشہ بہار۔ صفحہ ۳۰۶
(۱۷) بزم سخن صفحہ ۱۰۹
(۱۸) سخن الشعراء صفحہ ۴۷۹
(۱۹) تذکرہ نادر صفحہ ۱۵۴ بحوالہ نقوش میر نمبر صفحہ ۱۰۲

باخود نہ بود کہ اتفاق انتخاب شعراہم می شدہ۔ از اشعار ایشاں آں چہ یاد بودنوشتم۔ طرفہ ترکہ میر چوں ہمت خود بہ انتخاب اشعار ناپسندیدہ شعراء گماشتہ بود۔ طبعش بہ ہمیں مرغوب گشتہ ازیں جہت از اشعار خود ہم ہرچہ درآں تذکرہ نوشتہ اکثرے ازآں بے رتبہ و ناپسندیدہ است۔ دردیوانش بہتر ازیں اشعار بہ نظرِ فقیر درآمدہ۔

شنیدم کہ محمد تقی میر سید نیست میر ناصر مرحوم والد میر درد بہ مشاہدۂ جودت طبعش در عنفوان جوانی و آغاز حالش می گفت کہ محمد تقی، میر میدان سخن وری خواہد شد۔ ازاں روز خودرا ملقب بہ میر ساختہ"(۲۰)

میر غلام حسین شورش اس طرح لکھتے ہیں:

"شاعرے بے نظیر محمد تقی میر تخلص۔ شاگرد خان آرزو۔ متوطن اکبرآباد۔ الحال درشاہجہاں آباد تشریف می دارند۔ فخرِ شاعران دہلی خودرامی دانند۔ چنانچہ درتذکرہ خود شعر شاعران ہندوستان غلط تلاش نمودہ ومرقوم ساختہ۔ اگر غلط بہ دست نیامدہ تاہم اعتراض بے جاواصلاح خود جاری نمودہ وزندہ ومردہ کسے راسلامت نہ گذاشتہ' مگر بعضے اعزّہ کہ از ومربوط بودنداں محفوظ داشتہ۔ غرض عجب کسے است۔ درتذکرہ خودراسید نوشتہ اند۔ مردماں گویند کہ شیخ است چنانچہ کسے گفتہ "شیخ تقی نام ہواور میر کہاوے" دیگری گوید "دلی میں شیخ زادہ گنجفہ کا میر ہے"۔ سوائے ازیں فتح علی گردیزی درتذکرہ خود تقی میر راسید نوشتہ است۔ پس الیشاں رابرائے استحکام سیادت کاذبہ خود میر تخلص نمودہ اند"(۲۱)

اس میں کوئی شک نہیں میر ایک غیر معروف خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ سید بن جانا ہمیشہ سے ایسے خاندانوں کا مشغلہ رہا ہے اسی ذہنیت کے تحت جب میر نے سید ہونے کا اعلان کیا تو دہلی کی معتبر ہستیاں خندہ زنی کرتی رہیں اور ان کی بددماغی کے باعث مہذب لوگ ان سے دامن بچاتے رہے۔ دہلی کے قیام کے دوراں ایک بھی واقعہ نہیں ملتا جس میں

(۲۰) ابوالحسن امیر الدین احمد امراللہ الہ آبادی۔ تذکرہ مسرت افزا مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی ۱۹۶۸۔ علم مجلس کتب خانہ جمس پریس کلاں محل دہلی۔ صفحہ ۲۱۷۔۲۱۹

(۲۱) تذکرہ شعراء دوتذکرے جلد۲ صفحہ ۱۹۰

کسی بڑی مجلس میں میر کی پذیرائی ہوئی ہو۔ البتہ اپنی نیش زن طبیعت کے باعث بھری محفلوں میں اپنے آپ کوخود ہی رسوا کرتے رہے۔ دہلی کے ایک عام مشاعرہ میں اپنا قصیدہ اژدرنامہ پڑھا جس میں اپنے آپ کواژدھا کہا اور دیگر شعراء کو اپنے مقابلہ میں حشرات الارض قرار دیا، مشاعرہ میں شریک ایک شاعر محمد امان نثار نے میر کی لاف زنی کے جواب میں اسی وقت ایک قطعہ کہہ کہ حاضرین مشاعرہ کو سنایا جس میں انھوں نے میر کے "اژدرشاعری" کے کلّے چیر دیئے۔

حیدر کرارا نے وہ زور بخشا ہے نثار ایک دم میں دو کروں اژدر کے کلّے چیر کر

شعراء کے درمیان میر صاحب کی کتنی توقیر تھی وہ محمد حسین آزاد کی زبان اس طرح ہے: "چونکہ میر صاحب کی یہ بات کسی کو پسند نہ آئی تھی اس لئے اس قطعہ پر خوب قہقہے اڑے اور بڑی بڑی واہ واہ ہوئی اور میر صاحب پر جو گذرنی تھی گذری (۲۲)۔ پسماندہ طبقہ کا کوئی فرد اگر سماجی طور پر نام ونشان حاصل کرے تو خاندانی پس منظر نہ ہونے اور عدم تربیت کے باعث وہ ایک نفسیاتی خلجاں میں مبتلا ہو جاتا ہے اندر کے احساس کمتری اور باہر کے احساس برتری کے درمیان شدید جنگ ہونے لگتی ہے۔ عدم تربیت اور علم مجلسی سے ناواقف ہونے کے باعث عجوبہ روزگار بن جاتا ہے۔ یہی کچھ میر تقی میر کے ساتھ ہوا اور وہ بھی تمام عمر عجوبہ روزگار بنے رہے۔

میر تقی میر اپنے بغض وعناد کے باوجود ہر مرحلہ پر سراج الدین علی خاں آرزو سے رشتہ داری کو اپنے مفاد میں استعمال کرتے رہے۔ بیماری سے صحت یابی کے بعد جب تیئیس سال کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے انکشاف کیا کہ، "بڑی محنت اور جہد بلیغ سے مستند شعراء میں شمار ہونے لگے اور تمام شہر میں ان کا طوطی بولنے لگا"۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ "طوطی بولنے" کے باوجود ان کو ہر سرکار میں کسی نہ کسی کی سفارش اور سراج الدین علی خاں آرزو کی قرابت داری کی وجہ سے باریابی ملتی رہی تھی۔ علیم اللہ نامی شخص کے توسل سے رعایت خاں جو محمد شاہ

(۲۲) آب حیات صفحہ ۲۰۷

کے وزیر اعظم قمرالدین کے بھتیجے تھے کی سرکار میں بطور لشکری ملازم ہوئے ان کے سیاسی تنزل کے بعد محمد اسحاق خاں جو تیرہ سال سراج الدین علی خاں آرزو کے پاس بہت فراغت سے رہے تھے اور احمد شاہ کے عہد میں بخشی گری کے عہدے پر فائز تھے کی سرکار میں خاں آرزو سے تعلق قدیمی کے باعث لشکری کی حیثیت سے کام کرتے رہے، جب اسحاق خاں بنگش افغانوں سے جنگ کرتے ہوئے ۱۱۶۳ھ/ ۱۷۴۸ء میں مارے گئے تو میر فرخ آباد سے شکست خوردہ فوج کے ساتھ دہلی آئے اور نواب بہادر جاوید خواجہ سرا جو احمد شاہ بادشاہ کی والدہ نواب بائی کا خواجہ سرا تھا کی فوج میں بخشی اسد یار خاں کی سفارش سے ملازم ہوئے یہاں اتنی رعایت ضرور ہوئی کہ گھوڑا رکھنے اور روزانہ حاضری دینے سے معاف رہے۔ نواب بہادر جاوید خواجہ سرا کے قتل ۱۱۶۶ھ/ ۱۷۵۲ء کے بعد میر پھر بیکار ہو گئے۔ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء سے میر دیوان مہانرائن، راجہ جگل کشور، راجہ ناگرمل وغیرہ کے ساتھ مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرتے رہے اور بہت کسمپری کی زندگی بسر کی ۱۸/ رمضان ۱۱۸۵ھ/ ۲۵ دسمبر ۱۷۷۱ء میں جب شاہ عالم دہلی آ کر تخت شاہی پر بیٹھا تو میر بھی قدرت اللہ شوق کی اطلاع کے بہ موجب راجہ ناگرمل کے پاس قلعہ ڈیگ میں تھے اور ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء کے بعد دہلی آئے (۲۳)۔ اس طرح وہ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء سے لے کر ۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۵ء تک تقریباً بائیس سال دہلی سے باہر ہی باہر رہے۔

میر نے عمادالملک (۲۴) کی سرکار میں حاضری دینے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''فقیر کے حال پر بہت عنایت فرماتے ہیں، میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو بہت محظوظ ہو کر آتا ہوں'' ظاہر ہے کہ یہ ''حاضری محظوظی'' انعام و بخشش کی وجہ سے ہوتی ہوگی وہ مالی امداد کر کے رخصت کر دیتا ہوگا اس نے میر کو اپنی سرکار سے وابستہ نہیں کیا۔

دہلی کے افق سخن دانی پر اس وقت دھند چھا گئی جب میر عبدالحی تاباں ۱۱۶۴ھ/ ۱۷۵۰ء میں اور انعام اللہ خاں یقین ۱۱۶۹ھ/ ۱۷۵۶ء میں راہی ملک عدم ہوئے تقریباً اسی

(۲۳) طبقات الشعراء صفحہ ۲۴۱
(۲۴) احمد شاہ اور عالم گیر ثانی کا نمک حرام وزیر اعظم

سال میر سوز ''شیخ قیام الدین قائم۔ اشرف علی خاں فغاں دہلی چھوڑ گئے۔ ۱۱۷۰ھ/ ۱۷۵۷۔۵۶ء میں محمد رفیع سودا نے بھی دہلی کو خیر باد کہا۔ شاہ عالم کی بابت میر لکھتے ہیں:

''بادشاہ اکثر تکلیف کرد نہ رفتم'' آگے مزید کہتے ہیں ''گاہے گاہے بادشاہ ہم پئے فرستاد'' اس بے نیازانہ طرز عمل پر کہنا پڑے گا کہ جو شخص معمولی ہندو امیروں کے حضور کاسہ گدائی لیے کہے ''اسباب معیشت مفقود است حالت اضطرار است'' وہ اتنا متوکل اور قانع نہیں ہو سکتا کہ بادشاہ از خود بلائے اور وہ نہ جائے۔ غالباً میر کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ خواجہ میر درد نے شاہ عالم بادشاہ کو مجلس میں پانو پھیلانے پر ٹوک دیا تھا اس لیے میر تقی میر اپنے فقر و استغنا کے اظہار میں ان سے پیچھے کیوں رہتے۔

۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء میں محمد رفیع سودا نے وفات پائی۔ میر لکھتے ہیں ''ان ایام میں فقیر خانہ نشین تھا اور چاہتا تھا کہ شہر سے نکل جائے لیکن زادراہ سے مجبور تھا (۲۵)۔ میری عزت و آبرو کے تحفظ کے لیے نواب وزیر الممالک آصف الدولہ بہادر آصف الملک کے دل میں خیال آیا کہ میر پاس آئے تو اچھا۔ چنانچہ میری طلبی کے لیے نواب سالار جنگ خلف اسحاق خاں مؤتمن الدولہ نواب اسحاق خاں نجم الدولہ کے چھوٹے بھائی نے جو وزیر اعظم کے خالو ہوتے تھے ان قدیم تعلقات کی بنا پر جو میرے ماموں (۲۶) سے تھے کہا کہ اگر نواب صاحب از راہ عنایت کچھ نقد زادراہ کے طور پر بھیج دیں تو البتہ میر آئیں گے۔ ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء میں میر لکھنو جا پہنچے۔

قیام دہلی کے دوران میر اپنی ذات میں عجوبہ تو تھے ہی لکھنو پہنچنے کے بعد ان کے حواریوں نے بے سروپا حکایتیں تصنیف کر کے ان کو عجوبہ ترین بنا دیا۔ ذکر میر کا تھوڑا بہت تجزیہ کیا جا چکا ہے اب ان کہانیوں کی حقیقت بھی واضح ہونا چاہیئے جن کو پرستاراں میر نے

(۲۵) ان حالات میں بھی شاہ عالم بادشاہ کے دربار میں حاضر نہ ہوئے، جبکہ جگہ جگہ دست سوال دراز کرنے کا خود ذکر کرتے ہیں۔ اپنے احساس کمتری کے باعث وہ بڑی سرکاروں میں جانے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ علم مجلسی سے بے بہرہ ہونے کے باعث وہ آصف الدولہ سے بھی نباہ نہ کر سکے
(۲۶) یہاں پر بھی ''ماموں صاحب'' سراج الدین علی خاں آرزو ہی کا وسیلہ کام آیا۔

مزے لے لے کر بیان کیا۔ محمد حسین آزاد اپنے مخصوص انداز میں دہلی سے لکھنو کے سفر کی کہانی سناتے ہوئے کہتے ہیں کہ میر جس گاڑی میں سوار ہوئے اس میں ایک اور شخص بھی شریک سفر ہوگیا اس نے بات کرنا چاہی میرؔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہو بیٹھے۔ کچھ دیر کے بعد اس نے پھر بات کی۔ میرؔ صاحب چیں بہ چیں ہوکر بولے ''صاحب قبلہ آپ نے کرایہ دیا ہے۔ بے شک گاڑی میں ہی بیٹھئے مگر باتوں سے کیا تعلق۔ اس نے کہا حضرت کیا مضائقہ ہے۔ راہ کا شغل ہے باتوں میں ذرا جی بہلتا ہے۔ میر صاحب بگڑ کر بولے کہ خیر آپ کا شغل ہے میری زبان خراب ہوتی ہے''(۲۷)۔

سعادت خاں ناصر اس طرح لکھتے ہیں۔ ''حسب اتفاق ایک بنیے کے ساتھ گاڑی میں سوار ہوئے مگر سوار ہونے کے کچھ رات باقی تھی جب روز روشن ہوا اور صورت اس کی دیکھی منہ ادھر سے پھیر لیا۔ اور لکھنو تک اس کی طرف منہ کر کے نہ بیٹھے(۲۸)'' کہانی کا سقم یہ ہے کہ گاڑی میں میر تھے بنیا تھا اور گاڑی بان ہوگا۔ تذکرہ نویس کو یہ تمام روداد کس نے سنائی؟

ایک روایت یہ ہے کہ میر کا ہم سفر بنیا نہیں بلکہ ایک مشہور شاعر میر ضیاالدین ضیا تھے جن کی بابت میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء میں لکھا ہے(۲۹) ''میر ضیا الدین ضیا نام ضیا تخلص۔ متوطن دہلی۔ جوانے است۔ موؤب۔ مہذب۔ متواضع۔ بافقیر ربطے بسیار دارد''۔ اس تعلق خاطر کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ مذکورہ ہم سفر کوئی بنیا ہوگا۔ ضیا الدین ضیاء ہرگز نہ ہوں گے۔ لیکن اگر امیر الدین احراری جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ دونوں ''میر تقی میر اور ضیا الدین ضیا'' ایک مہینے تک ایک ہی گاڑی میں سفر کرتے رہے لیکن فن شاعری کے تکبر کے باعث ایک دوسرے سے ہم کلام نہیں ہوئے اور باہم پشت ملائے منہ پھیر کر بیٹھے رہے۔ ''تو دونوں حضرات کے خلل دماغ میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔''

(۲۷) آب حیات صفحہ ۱۹۶۔
(۲۸) خوش معرکہ زیبا۔ صفحہ ۴۲، ناشر شیخ محمد بشیر اینڈ سنز سرکلر روڈ چوک اُردو بازار لاہور۔
(۲۹) نکات الشعراء صفحہ ۱۳۱۔

دہلی سے لکھنو تک کا فاصلہ تین سو میل سے زیادہ ہے اس زمانے میں مسافر گاڑیوں کے فاصلے مقرر تھے۔ ایک منزل سے دوسری منزل زیادہ سے زیادہ آٹھ دس میل ہوتی تھی کیونکہ لے جانے والی گاڑی کو پھر اپنی منزل پر واپس آنا ہوتا تھا۔ دہلی سے ایک ہی گاڑی لکھنو تک جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کہانی میں صراحت کی گئی ہے کہ دہلی سے لکھنو کا سفر ایک ماہ میں طے ہوا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر منزل آٹھ دس میل کے فاصلے پر تھی۔ دہلی سے لکھنو تک ایک ہی گاڑی میں جانا کہانی کہنے والے کی عدم واقفیت ہے۔ جس سے کہانی محض اختراعی معلوم ہوتی ہے۔ ایک ماہ کا سفر ادلتی بدلتی سواری۔ ناممکن ہے کہ ایک ہی منزل کے ہم سفر ایک دوسرے سے بیگانہ رہیں۔

عماد الملک کے بارے میں میرؔ صاحب نے بہت احسان مندی کے جذبات کے ساتھ لکھا ہے کہ ''فقیر کے حال پر بہت عنایت فرماتے ہیں۔ جب بھی میں اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو بہت محظوظ ہوکر آتا ہوں'' میرؔ کی اس نیاز مندی سے ناواقف ''قصہ گو'' نہایت طمطراق سے میر کو وہاں لے جاتا ہے کہ عماد الملک غازی الدین خاں لب دریا بیٹھے ہوئے تھے اور مرغابیاں آبی بطخیں اور سرخاب واسطے سیر و تماشہ دریا میں چھوٹے ہوئے تھے۔ اتفاقاً میر صاحب بھی ادھر جا نکلے۔ نواب چند قصیدے اپنے پڑھ کر داد طلب ہوئے۔ میرؔ صاحب نے فرمایا میری تعریف کی کیا احتیاج ہے ہر بطخ کو صاحب کے اشعار پر حالت وجد و سماع ہے۔ نواب پر یہ سخن نہایت ناگوار گذرا اور دوسرے روز میرؔ صاحب کو خود طلب کیا آپ کرسی پر بیٹھے زمین پر سوائے خاک کچھ نہ بچھوایا میر صاحب نے لمحہ کے لمحہ انتظار مونڈھے چوکی کا کیا۔ بعد ازاں دوپٹہ دوتا کر کے بچھایا اور بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے فرمایا کچھ ارشاد کیجئے۔ میرؔ صاحب نے یہ قطعہ پڑھا۔

کل پانو ایک کاسہ سر پر جو آ گیا — یک سر وہ استخواں شکستہ سے چور تھا
کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر — میں بھی کبھو کسو کا سر پر غرور تھا
تھا وہ تو رشک حور بہشتی ہمیں میں میرؔ — سمجھے نہ ہم تو فہم کا اپنی قصور تھا

اسی کہانی میں پہلا نقص یہ ہے کہ کہانی کہنے والے کو یہ واقعہ کس نے سنایا۔ دوسرا نقص یہ ہے کہ یہ تقریب کس جگہ ہوئی۔ دہلی میں تو دریائے جمنا ہی ہے۔ عمادالملک مرغابیاں، آبی بطخیں اور سرخاب بغل میں دبا کر تو نہیں لے گیا ہوگا بالفرض خادم لے کر گئے تو دریا میں مرغابیاں اور سرخاب ڈالتے ہی اڑ جائیں گے البتہ آبی بطخیں ضرور تیرتی رہی ہوں گی لیکن دریا کی روانی کا کب تک مقابلہ کریں گی؟

قصہ گو نے اپنی بساط کے بموجب فرض کرلیا کہ عمادالملک مرغابیاں، سرخاب اور آبی بطخیں لے کر دریا کے کنارے جا بیٹھا اور میرؔ بھی چہل قدمی کرتے ہوئے وہاں جا پہنچے اگر قصہ گو ہوش مند ہوتا تو یوں کہتا کہ عمادالملک اپنی محل سرا میں جاری نہر یا حوض کے کنارے آبی پرندوں سے کھیل رہا تھا اور میر اس کے سلام کے لیے حاضر ہوئے تھے تو کسی قدر حقیقت سے قریب ہوتا۔ عمادالملک کا قصیدے کہنا اور میر کو سنانا اور ان کا بغیر کسی وجہ کے عمادالملک پر طنز کرنا۔ پھر عماد الملک کا میر کو دوسرے روز طلب کرنا خود کرسی پر بیٹھنا میر کا فرش خاک پر ''جلوس فرمانا'' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمادالملک کسی سڑک کے کنارے یا میدان میں جا بیٹھا نہ اس کی محل سرا تھی اور نہ دیوان خانہ جہاں میر کی نشست کے لئے کوئی چیز میسر نہ تھی شاید کہانی تصنیف کرنے والا میر تقی میرؔ کی بے باکی اور ہمت وجرائت بیان کرنا اور اپنا پسندیدہ قطعہ دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے اُس کو یہ معلوم نہیں کہ عمادالملک وہ ظالم اور سنگدل انسان تھا جس نے مغل بادشاہ احمد شاہ اور اس کی والدہ کو اندھا کرا کر قید کرایا اور عالمگیر ثانی کو فیروز شاہ کے کوٹلے میں قتل کرا کر لاش دریائے جمنا کے کنارے پھنکوادی تھی وہ دہلی کا بے تاج بادشاہ تھا میرؔ کی اس گستاخی پر تو وہ ان کی لاش سڑک پر پھنکوا دیتا تو کوئی پوچھنے والا نہ ہوتا۔ شاید اس ہی کہانی کو تصنیف کرنے والے نے یا کسی دوسرے نے اسی منظر نامے میں لکھا کہ ایک دن نواب آصف الدولہ نے میر تقی میرؔ کو بلا بھیجا جب پہنچے تو دیکھا نواب حوض کے کنارے کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی ہے پانی میں لال، سبز مچھلیاں تیرتی پھر رہی ہیں آپ تماشہ دیکھ رہیں ہیں۔ میر صاحب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا میر صاحب کچھ فرمایئے میرؔ

صاحب نے غزل سنانی شروع کی۔ نواب صاحب سنتے جاتے تھے اور چھڑی کے ساتھ مچھلیوں کے ساتھ کھیلتے جاتے تھے میر صاحب چیں بہ چیں ہوئے اور ہر شعر پر ٹھہر جاتے۔ نواب صاحب کہے جاتے تھے کہ ہاں پڑھیئے۔ آخر چار شعر پڑھ کر میرؔ صاحب ٹھہر گئے اور بولے پڑھوں کیا آپ مچھلیوں سے کھیلتے ہیں متوجہ ہوں تو پڑھوں نواب صاحب نے کہا جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرے گا۔ میر صاحب کو یہ بات زیادہ ناگوار گذری۔ غزل جیب میں ڈال کر گھر کو چلے آئے اور پھر جانا چھوڑ دیا۔ ایک ادنیٰ ملازم جس کی معاش کا انحصار ہی دربار داری پر ہو وہ جرأت کرسکتا ہے کہ اپنے آقا سے سرکشی کرے؟ محمد حسین آزاد ماشاء اللہ دوسروں کے مقابلے میں سلجھے ہوئے داستان گو ہیں لیکن طبع زاد کہانیوں میں کہیں نہ کہیں جھول آ جاتا ہے ''اس آنکھوں دیکھے'' واقعے میں آزاد کو معلوم ہو گیا تھا کہ میرؔ صاحب نے چار شعر پڑھے بہتر ہوتا کہ وہ یہ بھی بتا دیتے کہ وہ اشعار کیا تھے۔ میرؔ کی عظمت بڑھانے کی اس سازش میں نواب کے اس فقرے کی معنویت ان کی نظر سے اوجھل رہی کہ ''جو شعر ہوگا آپ متوجہ کرے گا'' نواب کا یہ جملہ فن تنقید کا اساسی اصول کہا جائے گا۔ اور میرؔ کے کلام پر انتہائی مختصر لیکن مدلل جامع وکامل تنقید ہے۔

محمد حسین آزادؔ ایک اور ''آنکھوں دیکھا'' حال بیان کرتے ہیں ''ایک دن بازار میں چلے جاتے تھے۔ نواب کی سواری سامنے سے آگئی دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے میر صاحب آپ نے تو ہمیں چھوڑ دیا کبھی تشریف بھی نہیں لاتے۔ میرؔ صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آداب شرفاء کے نہیں۔ یہ کیا گفتگو کا موقع ہے [30]'' کہانی گھڑنے والے اپنی حیثیت کے مطابق کہانی بناتے ہیں وہ یہ غور نہیں کرتے کہ آصف الدولہ شمالی ہند میں اس عہد کا سب سے بڑا مطلق العنان حکمراں تھا۔ میرؔ اس کے ملازم تھے نواب یکہ وتنہا بازار میں مٹرگشت تو نہیں کر رہا ہوگا اس کے ساتھ خدام اور محافظوں کا ایک انبوہ، ہٹو، بچو کرتا جلو میں چل رہا ہوگا۔ بازار بھی ویران اور سنسان نہیں ہوگا کہ میرؔ فوراً نظروں کے سامنے

(۳۰) آب حیات صفحہ ۱۹۷۔

آ گئے۔نواب یقیناً ہاتھی گھوڑے یا پالکی پر سوار ہوگا اس نے دور سے آواز تو نہیں لگائی ہوگی اور نہ میر نے ''اتالیق'' بن کر با آواز بلند تہدید کی ہوگی اگر ایسا ہوتا تو نواب کے ہم رکابوں کے ہاتھوں میؔر کی خیر نہ ہوتی آزاد کی کہانیوں میں یکسانیت بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات جملے بھی ایک جیسے ہوتے ہیں مثال کے طور پر بہادر شاہ ظفر نے ذوق کو کچھ دنوں بعد دیکھا تو یہی جملہ کہا۔ (۳۱)

مسند اودھ دہلی کے تخت طاؤس کے گل تکیوں سے ایسی سبحی کہ ہر شعبہ زندگی میں اس کی حریف بن گئی۔ مخصوص مسلک سے تعلق رکھنے کے باعث میر تقی میؔر کو لکھنو میں بام عروج پر چڑھا دیا گیا۔ اان کے خبط اور شوریدہ سری کو نازک مزاجی اور فقر و غنا کی جھنڈیاں لگا کر نظر فریب اور دل آویز بنایا گیا۔ لغؤ بے سروپا اور بعید از قیاس حکایتیں تصنیف کر کے خدائے سخن کے بھاری بھرکم خطاب سے نوازا گیا اور یہ نہ سونچا گیا کہ میؔر خستہ حال اس کے متحمل بھی ہوسکیں گے یا نہیں۔ خدائے سخن کی بات چلی ہے تو محمد حسین آزاد کی اس کہانی کو بھی سننا چاہیئے۔ ''میر قمرالدین منتؔ میر تقی میؔر کے پاس اپنی غزل پر اصلاح لینے کی غرض سے گئے میر صاحب نے وطن پوچھا۔ انھوں نے سونی پت بتلایا۔ آپ نے فرمایا اردو معلیٰ خاص دہلی کی زبان ہے آپ اس میں تکلیف نہ کیجئے اپنی فارسی وارسی کہہ لیا کیجئے''(۳۲)۔

میر قمرالدین منت فارسی زبان کے مسلم الثبوت شاعر مانے جاتے ہیں۔ میر نے بھی ابتدا فارسی شاعری سے کی تھی اور اس کے بعد اردوئے معلیٰ کے شاعر بنے تو میر قمرالدین منت کو اردو زبان کا شاعر بننے میں کیا دشواری ہوسکتی تھی کہ وہ میؔر کی شاگردی کا شرف حاصل کرنے کے لئے ان کے حضور حاضر ہوئے۔ ان کی والدہ دہلی کے بخاری خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ میر قمرالدین منت کا تعلق خاندان ولی اللٰہی سے رہا وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی شاہ فخرالدین سے سلوک و معرفت کے رموز سیکھے ان سے بیعت ہوئے۔ چونکہ تعلیم و تربیت دہلی میں ہوئی تھی اس لئے شرفائے دہلی میں شمار کئے جاتے تھے۔ گھربار سونی پت میں تھا جو

(۳۱) آبِ حیات صفحہ ۴۴۶۔

(۳۲) ایضاً صفحہ ۲۰۷۔

دہلی کے نواح میں سمجھا جاتا تھا۔ میر تقی میؔر اپنی بابت غور کریں کہ وہ اکبر آباد میں پیدا ہوئے جو دہلی سے تقریباً ڈیڑھ سو میل دور ہے سترہ برس تک اسی شہر میں رہے اس عمر میں مادری اور علاقائی زبان پختہ ہوجاتی ہے اور آخیر زمانہ تک اس کے اثرات قائم رہتے ہیں۔ اکبر آباد کبھی اردوئے معلیٰ کا مرکز نہیں رہا میر نے جو کچھ سیکھا وہ دہلی کے قیام کے دوران سیکھا جس کی تفصیل اس طرح ہے۔

۱۔ پیدائش اکبر آباد ۱۱۳۶ھ/ ۱۷۲۳ء۔ دہلی آمد ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء — قیام اکبر آباد ۱۶ سال
۲۔ ۱۱۵۲ھ/ ۱۷۳۹ء تا ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء عمر ۳۰ سال — قیام دہلی ۱۴ سال
۳۔ ۱۱۶۷ھ/ ۱۷۵۳ء تا ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء عمر ۵۲ سال — دہلی سے باہر ۲۲ سال
۴۔ ۱۱۸۹ھ/ ۱۷۷۵ء تا ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء عمر ۵۹ سال — قیام دہلی ۷ سال
۵۔ ۱۱۹۶ھ/ ۱۷۸۲ء تا ۱۲۲۵ھ/ ۱۸۱۰ء عمر ۸۷ سال — قیام لکھنو ۲۸ سال

میر تقی میر کا دہلی میں مستقل قیام محض اکیس سال رہا بائیس سال وہ ایک لشکری کی حیثیت سے مسلمان اور خاص طور سے ہندو امراء کے لشکروں میں پتی زبان خراب کرتے پھرے۔ دہلی کی تہذیب اور زبان سے محض اکیس سال تعلق رکھنے والا کس منہ سے ان اہل زبان کے منہ لگ سکتا ہے جن کی جنم بھومی ہی دہلی ہو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اردوئے معلیٰ روپ سنگھار کئے نہیں بیٹھی رہتی تھی وہاں تو چڑی مار پرندے بیچتے تھے۔ نان خطائی' کباب پراٹھے، گزک' قلفی والے اور نہ جانے کون کون اطراف جامع مسجد میں اپنے تھڑے لگاتے تھے اور شام کو شہر کے بے فکرے' تماش بین اور بازار کے کھانوں کی چاٹ رکھنے والے جمع ہو جاتے تھے اور وہ بولی بولتے تھے جو دہلی کے شہدوں اور عام ناخواندہ بازاری لوگوں کی تھی شہدوں کے بارے میں سید انشاء اللہ خاں انشاء لکھتے ہیں کہ اس فرقہ کا انبوہ متصل جامع مسجد دارالخلافہ اور چاوڑی میں ہوتا ہے۔ اور ان کو شہدہ جامع مسجد کہتے ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے کو او۔ ابے۔ او بے۔ بچا۔ ایسے۔ تیسے کہہ کر خطاب کرتے ہیں (۳۳)۔ اردوئے معلیٰ تو قلعہ

(۳۳) انشاء اللہ خان انشاء۔ دریائے لطافت مرتبہ مولوی عبدالحق۔ مترجم پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی دہلی۔ انجمن ترقی اردو۔ ۱۹۳۵ء اورنگ آباد۔ دکن صفحہ ۱۶۸۔۱۶۹۔

معلّی اور امراء کی محفل سراؤں میں رائج تھی یا صاحباں علم فضل کے ہاں ملتی تھی۔ جہاں میرؔ کی رسائی کبھی نہ ہوسکی۔ اور وہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جانے زبان ہی بولتے رہے۔

دہلی کا ماحول پرانی روایات پر مبنی تھا۔ وہاں حسب نسب اور خاندانی روایات کی بنیاد پر افراد کی توقیر اور تعظیم کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ میر کو دہلی میں وہ مقام نہیں ملا جو لکھنو میں حاصل ہوا۔ لکھنو شہر میں تو ابھی آبادکاری ہورہی تھی اور ایک ملا جلا مبہم اور تن پرور معاشرہ وجود میں آرہا تھا۔ سلطنت اودھ کی سرحدوں سے ملی ہوئی ایسٹ انڈیا کمپنی کی عملداری تھی اور نواباں اودھ براہِ راست اس کے دباؤ میں تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے اپنی نوآبادیاتی حکمت عملی کے تحت مرکز سے ٹوٹ جانے والے دیسی والیاں ریاست کی حوصلہ افزائی کی جن میں لکھنو کے حکمراں خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

مرکز کو کمزور، حقیر اور بے وقعت کرنے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو بہت کامیابی ہوئی۔ شجاع الدولہ کے عہد ہی سے مذہبی‘ سیاسی‘ تہذیبی‘ تمدنی حد یہ ہے کہ علمی اور ادبی اعتبار سے اودھ کو پایہ تخت دہلی کا حریف بنادیا گیا، دہلی اور لکھنو ایک خطِ مستقیم کے دو نقطے بن گئے جو بر صورت میں آمنے سامنے تھے۔ مذہبی تعصب، جوع الارض اور ایسٹ انڈیا کی ایماء کے تحت شجاع الدولہ نے روہیل کھنڈ کے افغانوں کو تہس نہس کر دیا۔ آصف الدولہ نے جبر اور ترغیبات کے ذریعہ مذہبی عقائد تبدیل کرائے۔ ان حکمرانوں نے اپنی سیاسی کورچشمی سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے عملداروں کو شمالی ہند میں قدم جمانے کے مواقع دیئے۔

جب والی بنارس راجہ چیت سنگھ نے ۱۱۹۵ھ/۱۷۸۱ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل وارن ہسٹنگز کو شکست دے کر گھیر لیا تھا تو ناعاقبت اندیش‘ جذبۂ حب الوطنی وآزادی سے نابلد آصف الدولہ اپنی فوج لے کر وارن ہسٹنگز کی مدد کرنے راجہ چیت سنگھ کے مقابلہ پر گیا اور وارن ہسٹنگز کو راجہ چیت سنگھ کے محاصرے سے نجات دلائی۔ جس پر میرسوزؔ نے اس طرح تہنیت پیش کی۔

ادھر دیکھو تو کس ناز وادا سے یار آتا ہے   مسیحا کی موئی امت کو ٹھوکر سے جلاتا ہے

اگر آصف الدولہ یہ حماقت نہ کرتا اور وارن ہسٹنگز گرفتار ہوجاتا یا مارا جاتا تو کوئی تعجب نہیں فرنگی کلکتہ سے بھی فرار ہوجاتے۔ آصف الدولہ کو اتنی سیاسی بصیرت نہ تھی کہ وہ یہ سمجھ لیتا کہ اس کی آنے والی نسلیں اس کے فرنگی دوستوں کے ہاتھوں دربدر ہوں گی اور ان کی مستورات اور بیگمات غراروں کے پائینچے اٹھائے جنگلوں میدانوں اور پہاڑوں میں ماری ماری پھریں گی۔

دولت کی فراوانی کے باعث اچانک وجود میں آنے والا یہ معاشرہ جو تاریخی معاشرتی اور ثقافتی بنیادوں پر قائم نہ تھا بہت جلد بے راہ روی کا شکار ہوگیا۔ یہاں کے حکمرانوں کی جبلی عیش پرستی نے لکھنو کے ماحول پر بدکرداری‘ بے غیرتی اور بدچلنی مسلط کردی اپنی ہی رعایا کی بیٹیاں‘ بہنیں اغوا ہوکر بالا خانوں کی زینت بنتی رہیں جو ہادی حسن رسوا کے فن سے حنوط شدہ ہوکر ہمیشہ کے لیے ان حکمرانوں پر لعنت ونفریں بھیجتی رہیں گی۔ اب اگر بے ضمیر لوگ ان بالا خانوں کو زبان، ادب، تہذیب وثقافت کا مرکز کہیں تو یہ ناپاک ضمیر کی آواز ہوگی۔ طرحدار لونڈیاں، نوچنیاں، طوائفیں محل سراؤں میں جا بیٹھیں۔ زور آور بیگمات ان کو گرم دست پناہوں سے داغتی رہیں اور اس جرم پر محلوں سے نکالی گئیں یا سکون دل کی خاطر کوئی اور سہارا ڈھونڈھ کر خود نکل گئیں۔ جنس پرستی کی اس ہاؤ ہو میں جب نواب سعادت علی خاں کو آسودگی حاصل نہ ہوسکی تو وہ انشاء سے جانوروں کے جنسی عمل کی تفصیل سن کر لطف اندوز ہوتے رہے۔ مرد وزن کے اس بے مہابا اختلاط کے باعث بہت سے منفعت بخش پیشے وجود میں آئے جن میں محل سراؤں اور بالا خانوں کے درمیان طلب ورسد کا شعبہ بہت اہم تھا۔ بداخلاقی، بدچلنی اور بے غیرتی کی اس گرم بازاری میں مجہول النسب افراد کی قطاریں طویل سے طویل تر ہوتی گئیں۔ ''نواب زادوں''، ''میرزاؤں'' اور ''سید زادوں'' کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا۔ کام چوری، مفت خوری، بے حسی اور بے غیرتی کے باعث ایسی حماقت آمیز ذہنیت وجود میں آئی جس کو پنڈت رتن ناتھ سرشار نے بہت خوبی سے محفوظ کرلیا ہے۔

شاہانِ اودھ نے اپنا مستقر' ایک چھوٹے سے شہر فیض آباد کو بنایا۔ ہندوؤں کی کثیر آبادی والے اس علاقے میں قدیم ہندو تمدن کے اثرات بہت گہرے تھے۔ مسلمانوں کی آبادی عام طور پر شہروں تک محدود تھی شجاع الدولہ کے عہد حکومت تک فیض آباد کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ شجاع الدولہ کی وفات (۱۱۸۸ھ/ ۱۷۷۴ء) کے بعد جب آصف الدولہ تخت نشین ہوا تو اس نے فیض آباد کے بجائے لکھنو کو اودھ کا پایہ تخت بنانا چاہا۔ وہ اپنی والدہ سے دور من مانی زندگی گذارنا چاہتا تھا لہٰذا برسراقتدار آنے کے سات سال بعد (۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) لکھنو آباد ہونا شروع ہوا۔ بہت سے خاندان فیض آباد سے منتقل ہوئے اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں خاص طور سے دہلی سے نقل مکانی کرنے والے لکھنو میں آباد ہونے لگے۔ لکھنو آباد ہی اس لیے ہوا کہ حاکم وقت اور اس کے امراء رنگ رلیاں منا سکیں۔

ابتدا میں شہر لکھنو ایسا پسماندہ تھا کہ شعراء نے اس کی ہجو تک کہہ ڈالیں۔ پورب کا یہ علاقہ رسم و رواج رہن سہن اور زبان کے اعتبار سے دہلی سے بالکل مختلف تھا۔ لکھنو کی تعمیر و ترقی آصف الدولہ کے عہد سے شروع ہوئی اور پون صدی کے اندر اندر علاقہ کا مشہور و معروف شہر بن گیا جو اپنی تہذیب و تمدن اپنے رسم و رواج اپنی ثقافت اپنے مذہبی عقائد اپنا ادب اور اپنی زبان رکھتا تھا۔ وقتی امن واماں اور دولت کی فراوانی کے نتیجہ میں جو سماجی نظام وجود میں آیا اس میں مذہبی عقائد کو رسم و رواج سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی تھی اخلاقی اقدار پس پشت ڈال دی گئیں۔ تصنع' بناوٹ اور نمائش کا چلن عام ہو گیا۔ امراء نے بالا خانے آباد کئے بالا خانوں نے سماجی زندگی میں عریانیت اور فحاشی کو عام کر دیا۔ ان تمام عوامل نے مل کر انداز فکر اور انداز گفتگو کو بھی متاثر کیا۔ پوربی لہجہ اور زبان' دہلی کے لہجہ اور بول چال سے جدا تھی۔ اس خالص نمائشی دنیا دار معاشرہ میں مذہب' اخلاق' تصوف' منطقیانہ اور فلسفیانہ موضوعات انجانی چیزیں تھیں۔ مذہبی اور اخلاقی قدروں سے ناآشنا اس معاشرے میں سب سے پہلے محمد رفیع سودؔا دہلوی سخن وری کی سوغات لیکر فیض آباد پہنچے اور تقریباً دس سال دربار داری اور اپنے مخالفین کی سرکوبی کرنے کے بعد راہی ملک عدم ہوئے۔

سودؔا کے پیچھے پیچھے میر سوزؔ بھی فیض آباد وارد ہوئے۔ ان کا تعلق سادات بخاری کے عاملین، مبلغین اور مصلحین کے خاندان سے تھا جو صدیوں سے بت کدہ ہند میں ایک خدا کے آگے سر جھکانے کا درس دے رہے تھے ان کے والد سید میر ضیاء الدین ایک عالم باعمل کی حیثیت سے جے پور میں درس و تدریس اور رشدہ وہدایت میں مصروف رہے۔ خود میر سوز حضرت شاہ فخر الدین رحمتہ اللہ سے بیعت تھے۔ مجموعی طور پر وہ ایک اعلیٰ ترین حسب نسب رکھتے تھے ان کی تعلیم و تربیت پاکیزہ اسلامی ماحول میں ہوئی تھی۔ جس کے باعث ان کے اوصاف حمیدہ اور اطوار پسندیدہ کی تمام معاصرین نے دل کھول کر تعریف کی ہے کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جس نے ان کے حسب نسب پر انگلی اٹھائی ہو یا ان کے سیرت و کردار اخلاق و اخلاص کی خرابی کے بارے میں ایک لفظ بھی کہا ہو۔ وہ اردو کے واحد شاعر ہیں جس نے نہایت جرائت اور بے باکی سے برسرِ دربار بادشاہ وقت شاہ عالم کو رموز سلطنت و حکمرانی ذہن نشین کرائے۔ جبکہ اس دور میں بوسۂ رکاب شاہی درباری شاعر کی قسمت کا ستارہ سمجھا جاتا تھا۔

خسروا اقلیم میں فرماں روائی کیجیے   رتبہ صاحب قرانی تک رسائی کیجیے
نائب اللہ کو لازم ہیں سب حق کی صفات   ائے صفات اللہ کچھ اپنی بڑائی کیجیے
تیغ سلطان ناخن تدبیر ہے لاریب فیہ   اس سے عقدے کھولیئے مشکل کشائی کیجیے
پرخطر دولت' یہ زر دولت ہے ائے صاحب نظر   نیک و بد کو دیکھ یا ہم سے جدائی کیجیے
نیک سے نیکی جزا ہے، بد سے لازم ہے بدی   فرض کو پہچانیئے ویسی دوائی کیجیے
بعد ازاں مختار ہوائے بادشاہ مومنیں   خواہ شاہی کیجیے یا پھر گدائی کیجیے
گر گدائی کیجیے تو بوسہ محبوب کی   ورنہ مثل سوزؔ ناحق جگ ہنسائی کیجیے

اس قطعہ کا ایک ایک لفظ میر سوزؔ کے علم و دانش اور فہم و فراست کا عکاس ہے میر سوز شاہ عالم کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ماضی میں اس سے جو سیاسی حماقتیں سرزد ہوئی تھیں ان کے تناظر میں آنے والے واقعات کے لیے ایک دانشمندانہ سیاسی حکمت عملی وضع کرنے کی طرف راغب کیا گیا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سوزؔ نے جو پیشن

گوئی کی تھی وہ درست ثابت ہوئی شاہ عالم بادشاہی نہ کر سکا بلکہ تمام عمر گدائی کرتا رہا۔

جولوگ میر تقی میر کی بابت کچھ زیادہ کہنا چاہتے ہیں وہ اس قطعہ کو پڑھ لیں۔ بلاوجہ سورج کو چراغ دکھانے کی غلطی نہ کریں۔

انہوں نے شاعری کے ذریعے دربار داری اور وظیفہ خواری کو اپنا شیوہ نہیں بنایا بلکہ اپنے دور کے سب سے زیادہ معزز پیشہ یعنی فوجی ملازمت کو اختیار کیا اور اس کے شعبہ سواری، کمانداری، سپہ گری اور توپ سے نشانہ لگانے کے فن میں کمال حاصل کیا تھا اسی کے ساتھ اس زمانے کے انتہائی معزز اور قابل قدر جس کو فن شریف کہا جاتا تھا خوش نویسی میں بلند مقام حاصل کیا تھا۔ انھوں نے فن شاعری کو بطور پیشہ اختیار نہیں کیا۔ البتہ دوستوں کے اصرار پر اس فن میں اپنی اعلیٰ فطری صلاحیتوں کا شاندار مظاہرہ کیا۔ اور اپنے دور کے نامور اساتذہ میں شمار کیے جانے لگے۔ وہ زبان و بیان، فنی رجحانات، اساتذہ کی روایت اور دبستان دہلی کے نمائندہ شاعر تھے۔ تصوف انھیں میراث میں ملا تھا۔ تحمل، درگذر، صلہ رحمی، بردباری، سیر چشمی، اخلاق، تہذیب، شائستگی غرض جملہ اوصاف پاکیزہ ان کے ذاتی جوہر تھے۔

دبستان دہلی کے ان دونمایندہ شاعروں کو اس نئی سرزمیں پر فکر وفن کی تخم ریزی کرنا تھی۔ سوداؔ قصیدے سے آگے نہ بڑھے۔ سوزؔ غزل سے پیچھے نہ ہٹے۔ دہلی سے آنے والے ان دو شاعروں کی زباں، اسلوب، لے اور آہنگ اس علاقے کے افراد کے لیے نیا تھا۔ دہلی سے آنے والے دوسرے شاعر، ان دونوں بزرگوں سے خورد سال تھے لکھنو نژاد شاعر ابھی نو آموز تھے۔ دہلی کے نوواردوں کی ابھی شناخت بھی نہیں ہوئی تھی۔ معاشرے کی اس جانی انجانی غیر مرتب کیفیت آتش کے اس شعر میں ملتی ہے۔

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

سوداؔ کی غزل میں قصیدے جیسا جوش وخروش اور زور آزمائی کے ساتھ فارسی، آب و رنگ چھایا ہوا ہے۔ خواجہ میر دردؔ نے اپنے تصوف کو غنچہ ناشگفتہ رکھا۔ زباں بھی باتو قیر اور بوجھ بھرم والی استعمال کی۔ مجموعی طور پر سوزؔ، سوداؔ، اور خواجہ میر درد کی اردوئے معلیٰ کی قوت

تخلیق وارقوت کمال کا بوجھ لکھنو کے ''بانکے چھبیلے'' نہیں اٹھا سکتے تھے دہلی کی زبان کو لکھنو میں نئی مرتب ہونے والی بولی کیا سمجھے۔ جسم کو چومنے والا دل کی دردمندی کو کیسے جانے۔ جسمانی نشیب وفراز کے متوالے فکر وفن کی گہرائی اور گیرائی کس طرح ناپیں۔ مذہب سے دور، اعلی انسانی اوصاف سے بے خبر، رامش ورنگ کے خوگر میر سوزؔ کے تصوف، قلبی پاکیزہ احساسات، داخلیت کا رچاؤ والی فکر بلند کی طرف کون متوجہ ہوتا۔ انکی زبان و بیان کی خوبی، تصوف کی ہمہ جہتی، مذہبی اور اخلاقی اقدار، مطالعہ کائنات اور اس کا منطقی انجام، جیسے اعلیٰ موضوعات کی فراوانی، لکھنو کا معاشرہ قبول نہ کر سکا اُس کو سوزؔ کی شاعری کا وہ پہلو بہت پسند آیا جس کو انھوں نے ''چونچلہ اور نکتورا'' کہا ہے۔ اس چٹ پٹے چونچلے اور نکتورے کی ایسی چاٹ پڑی کہ کسی نے ان کے سنجیدہ پر معنی، روح پرور اور بالیدہ کلام کی طرف توجہ نہ دی۔ دیکھتے ہیں دیکھتے نوجوان شاعران کی تقلید میں خارجیت پر مبنی مضامین ایجاد کرنے لگے۔ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ان میں سے کوئی سوزؔ کی پیروی نہ کر سکا اپنی کم مائیگی کے باعث انہوں نے چونچلے اور نکتورے کو فحش ریختی اور غزل کو تقریباً ہزل بنادیا۔

میر تقی میرؔ کے حالات مستند تذکروں کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں پیش کئے جاچکے ہیں جن سے ان کی زندگی کے نشیب وفراز اور ان کے مزاج کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مذہبی ماحول میں پرورش پانے کے باوجود ان کی سیرت میں مذہبی اور اخلاقی اوصاف پیدا نہ ہو سکے باپ کے پڑھائے ہوئے عشق حقیقی کے اسباق انھوں نے عشق مجازی کے گلے سڑے اوراق پر منتقل کر دیئے۔ عزیز واقارب کے احسانوں کے باوجود وہ ان سے بغض وحسد رکھتے رہے۔ معاصرین کے ساتھ بھی ان کا رویہ اچھا نہ رہا۔ اس دور میں امراء ورؤساء کی محلسراؤں میں منعقد ہونے والی مجلسیں نوعمروں کے لیے علم مجلسی کی تربیت گاہیں ہوا کرتی تھیں بدقسمتی سے ادنیٰ ملازم ہونے کی وجہ سے میر تقی میرؔ کو ان محفلوں میں بار پانے کا موقع بھی نہ مل سکا۔ شخصیت میں کوئی عظمت، دل آویزی اور کشش نہ ہونے کے باعث معروف صاحبانِ عز وجاہ، فضلاء اور صلحاء کی صحبتوں میں شریک نہ ہونے کی وجہ سے علمی استعداد، شائستگی فکر،

وسعت قلبی اور ملنساری و خاکساری پیدا نہ ہوسکی۔ بائیس خواجاؤں کی چوکھٹ والے شہر کے روحانی فیوض و برکات کے اثرات بھی قبول نہ کر سکے۔ تصوف کے کوچہ سے ان کا کبھی گذر نہ ہوا۔ نہ انھوں نے سراج الدین علی خاں آرزو کا عالمانہ انداز سیکھا اور نہ فن شاعری میں تحریک مظہری کے مفہوم کو سمجھا۔

ہندو امراء کی سرکاروں میں تقریباً بائیس سال ادنیٰ ملازمتیں کر کے انھوں نے اپنی زندگی گذاری۔ بائیس سال وہ دہلی سے بہت دور چھوٹے چھوٹے مقامات پر رہے۔ جہاں کا ماحول علم وفن سے بے گانہ تھا۔ ان سرکاروں میں میر کے علاوہ کوئی اور صاحب فن بھی نہ تھا جس سے تبادلہ خیال ہوتا اور فہم و دانش کو جلا ملتی۔ بائیس برس دہلی سے دور رہنے کے باعث اس عرصہ میں دہلی کی علمی مجلسوں میں جو ذہنی اور فکری نشوونما ہوئی میر اس سے بے گانہ محض رہے۔ کمبیھر، کاماں (جے پور) قلعہ ڈیگ جیسے غیر معروف، دور افتادہ مقامات پر جہاں صاحبان علم موجود نہ ہوں میر کے شاعرانہ فکر وشعور میں کیا اضافہ ہوسکتا تھا؟ اسلامی تہذیب و تمدن کے مرکز دہلی سے دور ہونے اور ہندوؤں کے گنجان آبادی والے یہ علاقے میر کے شعری ذوق کو کیا ساماں فراہم کر سکتے تھے؟ اتنے طویل عرصہ دیہاتی لوگوں سے سابقہ رہنے اور دیہاتی بولی سنتے سنتے میر کے مزاج اور زبان پر ان کے گہرے اثرات پڑے۔ ان کی زبان پر رکیک اور مبتذل الفاظ چڑھ گئے اور وہ ایسے دیہاتی الفاظ بولنے لگے جو شرفائے دہلی نہیں بولتے اسی کے ساتھ غیر مہذب اور ناشائستہ ماحول میں رہنے کے باعث ذہنیت بھی پراگندہ ہوگئی اور خوب وزشت کی تمیز جاتی رہی۔ کلام کے سرسری مطالعہ ہی سے انداز ہوجاتا ہے کہ جس ماحول میں وہ رہے محدود اور پسماندہ تھا دیہاتی الفاظ کی بہتات اور ان کو غیر محتاط طریقہ سے استعمال کرنے کی عادت اسی دور میں پڑی۔ غیر ترقی یافتہ اور کم علم لوگوں میں رہنے کی وجہ سے مطالعہ، مشاہدہ، غور وفکر، تدبر و تعمق کی صلاحیت جاتی رہی۔

فنی اور موضوعاتی نقطہ نظر سے جب میر کے کلام کا جائزہ لیا جاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ میر جب اپنی شخصیت کو داخلی اور خارجی اعتبار سے مزین نہ کر سکے تو اپنے فن میں سلیقے

اور قرینے کو کیسے رائج کر سکتے تھے اپنے کاروبار عشق میں بھی انھوں نے پھوہڑ پن سے کام لیا اور اپنے معاصرین سے بھی جنگ و جدل کرتے رہے۔ فن کار کی شخصیت، مزاج اور ذہنیت کا اثر اس کے فن پر ضرور پڑتا ہے۔ میر کی غیر معتدل طبیعت کے باعث ان کے فن میں، فکری اعتدال و توازن اور ترتیب مفقود ہے۔ غزل کو اس کے شستہ مزاج کی بنیاد پر مزین اور مرتب کرنے کا ان کو شعور نہیں ہے۔ نہ فکر میں بالیدگی اور جمالیاتی ذوق موجود ہے۔ جو لوگ ان کو فطری شاعر کہتے ہیں وہ غلطی پر ہیں اگر وہ فطری شاعر ہوتے تو کہنے والے کو یہ کہنا نہ پڑتا ''پتش بغایت پست و بلندش بسیار بلند'' وہ اپنے زمانے کے عام رجحان کے زیر اثر شاعر بنے۔ غیر متوازن فکر اور ذوق سلیم سے محرومی کے باعث پچھتر فیصد اشعار قلم زد کر دیے جانے کے لائق ہیں۔ ہزاروں اشعار میں چند سو شعر کام کے نکل آئیں تو یہ کمال فن کی دلیل نہیں ایک دیوانہ بھی مہمل اور مجہول باتوں کے بیچ کوئی کام کی بات کہہ جاتا ہے۔ ان کی شاعری کی غیر سلیقہ مندی ان کے مزاج کی غیر سلیقہ مندی سے عبارت ہے جس کا ان کو بھی احساس تھا۔

برہمی حال کی ہے سارے مرے دیواں میں   سیر کر تو بھی یہ مجموعہ پریشانی کا

ان کی افتادِ طبع کی خرابی یہ ہے کہ وہ اس عیب کو ہنر سمجھ کر فخر کرتے ہیں۔ جمالیاتی ذوق کے فقدان کے باعث وہ خوب و ناخوب میں تمیز نہیں کر پاتے ''مستند ہے میرا فرمایا ہوا'' کی تعلیٰ ان کو یہ سمجھنے نہیں دیتی کہ کون سا شعر اعلیٰ ہے اور کون سا ادنیٰ ہے۔ امیر الدین احمد امر اللہ الہ آبادی نے بھی اس طرح لکھا ہے۔

''طرفہ تر کہ میرؔ چوں ہمت خود بہ انتخابِ اشعارِ شعراء گماشتہ بود۔ طبعش بہ ہمیں مرغوب گشتہ ازیں جہت از اشعار خود ہم ہر چہ در آن تذکرہ نوشتہ اکثرے از آں بے رتبہ و ناپسندیدہ است۔ در دیوانش بہتر ازیں اشعار بہ نظر فقیر در آمدہ''(۳۴)

اعلیٰ اور ادنیٰ اشعار پر مشتمل غزل میں اگر اچھے شعر کے بعد کوئی کم رتبہ شعر آجاتا ہے تو مجموعی طور پر پوری غزل کا تاثر باطل ہوجاتا ہے۔ نقادان فن کامیاب غزل اس کو قرار

(۳۴) تذکرہ مسرت افزا صفحہ ۱۹۹۔۲۰۰

دیتے ہیں کہ پانچ اشعار کی غزل میں کم سے کم تین شعر اعلیٰ مرتبہ کے ہوں اردو غزل گو شعراء میں میر تقی میر واحد شاعر ہیں جو غزل کی تزئین و آرائش کے فن اور تغزل کے رمز سے نا آشنا ہیں۔ مثال کے بطور ایک گوارا غزل میں جب یہ شعر آتا ہے۔

نہ پوچھ کچھ لب تر سا بچے کی کیفیت　　　کہوں تو دختر رز کی فلان جل جاوے

میر نے تو جو کچھ جلایا سو جلایا پڑھنے والے کا دل خواہ مخواہ جل گیا۔ اور پوری غزل اس کے نزدیک فضول محض ہوگئی۔

ایسے رکیک اور مبتذل الفاظ تو بازاروں کے کنارے چبوتروں پر بیٹھے اوباش بولا کرتے ہیں۔ شاعر کو ہر دور میں مہذب، شائستہ، صاحبِ علم اور دانشور سمجھا جاتا رہا ہے۔ اردو کے دوسرے شاعروں کے ہاں بھی جنسی ابتذال موجود ہے لیکن میر نے سوقیانہ خیالات کو پست ذہنیت کے ساتھ بالکل برہنہ طور پر کراہیت آمیز طریقہ سے بیان کیا ہے جو ان کے اپنے مزاج کا آئینہ دار ہے۔

پورب کی اس سرزمین میں پوربی بول چال کے بیچ جب میر تقی میر اپنی عوام پسند بولی جس کو وہ ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' کہتے ہوئے لکھنو پہنچے تو ان کی سادہ، ہندی آمیز، عامیانہ روش، تفکر و تدبر اور علم و دانش سے معرّا، سخن وری کو اس خوش باش معاشرے میں بہت پسند کیا گیا۔ ان کی شاعری مذہبی، روحانی، اخلاقی، موضاعات سے بحث نہیں کرتی اس میں عالمانہ، صوفیانہ، فلسفیانہ اور منطقیانہ بلند خیالی نہیں ہے بیشتر کلام لا یعنی مفروضات پر مبنی ہونے کی وجہ سے حقیقت سے دور اور روح استدلال سے بالکل خالی ہے اس میں اوج و کمال نہیں پایا جاتا۔ وسعت مطالعہ اور قوت مشاہدہ کی خامی کی وجہ سے فنی کند ذہنی غالب ہے اور شاعرانہ بالغ نظری اور دانشمندی نظر نہیں آتی۔

پستش بہ غایت پست و بلندش بسیار بلند کہنے والے نے میر تقی میر کے کلام پر مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے لیکن ان کی تعریف و توصیف ایسے باکمالوں نے کی ہے کہ ان سے اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کی جاسکتی مثلاً:

۱۔ محمد رفیع سوادکا یہ شعر میر تقی میر کی توصیف میں پیش کیا جاتا ہے۔

سودا تو اس غزل کو غزل در غزل ہی لکھ　　　ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی نے لکھا ہے کہ یہ مقطع کلیات سودا ایجرٹن۔ فورٹ ولیم اور نیزن کے مطابق ''دیکھوں ہوں یوں میں اس ستم ایجاد کی طرف'' والی غزل کا ہے۔ دوسری غزل کا مطلع ایجرٹن۔ فورٹ ولیم براؤن کے مطابق ''مائل تھا بسکہ دل مرا بیداد کی طرف'' ہے۔ سودا نے یہ دو غزلیں علیحدہ علیحدہ لکھی تھیں لیکن بعد میں دونوں غزلوں کو ملا کر ایک کر دیا۔ اور میر سے مقابلہ والا مقطع حذف کر دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ مقطع، سودا نے میر کی توصیف میں نہیں کہا تھا بلکہ ان پر چوٹ کرنے اور چھیڑنے کے لئے کہا تھا۔ جب دیوان مرتب کرنے کا وقت آیا تو یہ شعر خارج کر دیا اور بارہ اشعار کی ایک غزل کر دی۔

سودا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ عالم غیظ و غضب میں بہت کچھ کہہ جاتے تھے لیکن جب غصہ فرو ہو جاتا تھا تو دل صاف ہو جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے حضرت مظہر جان جاناں، خواجہ میر درد اور میر تقی میر کی بابت جو کچھ کہا اس کو داخل کلیات نہیں کیا۔

۲۔ شیخ غلام ہمدانی مصحفی

اے مصحفی تو، اور کہاں شعر کا دعوی　　　پھبتا ہے یہ انداز سخن میر کے منہ پر
غزل اے مصحفی یہ میر کی ہے　　　تمہاری میر زائی ہو چکی بس

مصحفی کے پہلے شعر میں میر کے انداز سخن کی اور دوسرے شعر میں غزل گوئی کی تعریف کی گئی ہے۔

۳۔ شیخ امام بخش ناسخ

جانتے ہیں خوب اردوئے معلّٰی کی زبان　　　مدتوں صحبت رہی ہے ہم کو ناسخ میر سے
شبہ ناسخ نہیں کچھ میر کی استادی میں　　　خود وہ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
میں ہی اے ناسخ نہیں کچھ طالب دیوان میر　　　کون ہے جس کو کلام میر کی حاجت نہیں

(۳۵) ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی کلیات سودا۔ جلد اول۔ مجلس ترقی اردو کلب روڈ، جنوری ۱۹۷۳ء لاہور صفحہ ۱۲۵

پہلے شعر میں ناسخ میر کے توسل سے اردوئے معلیٰ کے ماہر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں دوسرے شعر میں میر کے استاد ہونے اور تیسرے میں ان کے کلام کی مقبولیت کا ذکر ہے۔ وجوہات کا تذکرہ نہیں ہے۔

۴۔ محمد ابراہیم ذوق

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب　　ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ذوق میر کی شاعری کے انداز کی تعریف کرتے ہیں۔

۵۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ　　آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں
ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا
میر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالب　　جس کا دیوان کم از گلشن کشمیر نہیں

پہلے شعر میں غالب نے ناسخ کے قول کو دہرایا ہے کہ جو میر کا معتقد نہیں وہ جاہل ہے دوسرے شعر میں وہ میر کو ریختہ کا استاد مانتے ہیں تیسرے شعر میں وہ کلام میر کی بوقلمونی اور رنگا رنگی کی تعریف کرتے ہیں۔

غالب کے دو اشعار میں ان کو ایک بڑا شاعر بتایا گیا ہے کس وجہ سے بڑے ہیں یہ نہیں بیان کیا گیا ہے تیسرے شعر میں میر کے کلام کی یہ خوبی بتائی گئی ہے کہ وہ رنگین اور حسین ہے۔

۶۔ خواجہ حیدر علی آتش

آتش بقول حضرت سودا شفیق من　　ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

آتش نے صرف سودا کے الفاظ دوہرا دیے ہیں۔

۷۔ مصطفیٰ علی خاں شیفتہ

نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن

کبھی دل میں ہوائے شیوہ ہائے میر پھرتی ہے

شیفتہ بھی میر کے شیوہ سخن کے معترف ہیں۔

۸۔ الطاف حسین حالی

حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے　　شاگرد میرزا کا مقلد ہے میر کا

حالی نے یہ نہیں بتایا کہ وہ میر کے مقلد کیوں ہیں۔

۹۔ سید فضل الحسن حسرت موہانی

شعر میرے بھی ہیں پُر درد و لیکن حسرت　　میر کا شیوہ گفتار کہاں سے لاؤں

حسرت موہانی میر کے انداز گفتگو اور طرز کلام کی تعریف کرتے ہیں۔

مصحفی، ذوق، میر کے ''انداز'' شیفتہ ''شیوہ ہائے میر'' اور حسرت موہانی نے میر کے ''شیوۂ گفتار'' کو ان کا کمال فن قرار دیا ہے جس کو اصطلاح میں اسلوب کہا جاتا ہے۔ ان ماہرین سخن نے بہت اچھی بات کہی ہے اور اس میں ذرہ برابر شک نہیں کیا جا سکتا کہ میر کی مقبولیت اور شہرت ان کے اسلوب کے باعث ہوئی۔ روزمرہ کی عام باتیں سادہ زبان میں ملائم لہجہ کے ساتھ۔ بولنے کا انداز دوسروں سے ذرا جدا۔ زندگی کے غم و آلام کا دکھڑا ایک موضوع مشترک۔ جس میں ہر فرد مبتلا اور شاعر کا ہم نوا۔ ستم گر محبوب سامعین کو بھی مرغوب اور مطلوب اور لکھنو کے بالا خانوں پر موجود۔ کلام میں اوسط درجہ کے لوگوں کے خیالات جن کو سمجھ لینے والوں کی تعداد ہر دور میں زیادہ رہی میر کے ورود لکھنو (۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) تک یہ شہر تعلیم، تہذیب و ثقافت اور علم و فن کا گہوارہ نہ بنا تھا۔ صرف شاہدان بازاری کے چہکتے مہکتے بالا خانے موجود تھے جن کے وسیلے سے شاعروں کا کلام دور و نزدیک پہنچ جاتا تھا۔ شائقین کو جو بھی میسر آیا اسی پر اکتفا کیا اس سے غرض نہ تھی کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ فنی امور سے آگاہی اور ادبی مذاق بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ اردوئے معلیٰ پر میر جب اپنی دیہاتی بولی کا ''چھینٹا مار'' کر ''پر مجھے گفتگو عوام سے ہے'' کہتے ہوئے لکھنو پہنچے تو ان کے عامیانہ افکار و خیالات سب کی سمجھ میں آ گئے اس ''چھینٹا ماری'' بولی ہی نے ان کو پر اثر اسلوب دیا۔ سادہ عام فہم انداز گفتگو کے باعث کلام میں ایک قسم کی گھلاوٹ اور رچاؤ پیدا ہو گیا۔ دردمند لے نے دلوں پر چوٹ لگائی جیسے کوئی پردیسی بیراگی من کے بھیدوں کی مالا جپ رہا ہو۔ لکھنو میں اس وقت کوئی ایسا نہ

تھا جو ان کے فن کے نقائص اور عیوب اور اس کی ظاہری اور معنوی کم مائیگی پر اظہار خیال کرتا۔ صرف منتخب غزلیں منتخب کئے ہوئے اشعار کے ساتھ گردش کرتی رہیں اور آج بھی کر رہی ہیں۔ حد یہ ہے کہ آج کی اردو نصابی کتابوں میں بھی الٹ پلٹ کر وہ ہی غزلیں شامل کردی جاتی ہیں جو زبانوں پر چڑھی ہوئی ہیں۔ ان کی کلیات پہلی بار فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ان کی وفات کے ایک سال بعد ۱۸۱۱ء میں منظر عام پر آئی اس سے پہلے ان کا کلام بیاضوں، تذکروں اور قلمی مسودوں میں اپنی اپنی پسند کے مطابق محفوظ تھا۔

میر کی خوش قسمتی کہ ان کی زندگی میں اردو غزل کے رنگ محل کے تین ستون (جس کے چوتھے ستون وہ خود ہیں) یعنی میر سوز، محمد رفیع سودا اور خواجہ میر درد اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ میر تقی میر، میر سوز کی وفات (۱۲۱۳ھ/۱۷۹۸ء) کے بعد بارہ سال (۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء) تک زندہ رہے ان کی مثال کسی مشاعرہ کے آخری شاعر جیسی ہے جو محفل پر اختتامی تاثر چھوڑ جائے اور سامعین پہلے شاعروں کو فراموش کردیں۔ آسیائے فلک کا پیا ہوا بہت باریک ہوتا ہے یہ زمانہ ہی بناتا ہے اور زمانہ ہی بگاڑتا ہے۔ کسی فنکار کی فکر، اس کے تقاضے، اس کی ترجیحات، اس کی پسند اور ناپسند اس دور کے تابع ہوتی ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے۔ شہرت اور مقبولیت من جانب اللہ ہے۔ پرسکون زمانہ بھی افراد کے لیے بے سکون ہو جاتا ہے اور متغیر زمانہ بھی افراد کو نیچے سے اٹھا کر بلندی پر پہنچا دیتا ہے۔

میر دہلی میں ''میر'' نہیں بنے لکھنو نے انہیں ''میر'' بنایا۔ یہ بھی نیرنگئ فلک ہے کہ ایک حکمراں نے ان کو لکھنو بلایا تین سو روپیہ وظیفہ مقرر کیا لیکن شاید اس کے جانشین کا معیار مردم شناسی اپنے پیش رو سے زیادہ بلند تھا کہ اس نے درباری داری موقوف کر دی اور وظیفہ بند کر دیا[۳۶]۔ دہلی میں فن کی پرکھ رکھنے والے موجود تھے لکھنو میں میر کے زمانے تک فن کو جانچنے والے موجود نہ تھے۔ میر کی جتنی استعداد تھی اس کے مطابق انھوں نے کہا، اہل لکھنو کی علمی لیاقت میر کی استعداد سے بھی کم تھی اس لیے ان کو کلام میر ''چیزے گرد'' معلوم ہوا۔

---

(۳۶) مجمع الانتخاب صفحہ ۳۹۷-۳۹۹۔

ہر تخلیق اپنے دور کے انفرادی اور اجتماعی رجحانات کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں تخلیق کار کی جبلت کی نبض تیز تیز دھڑکتی ہے۔ جن افراد کی جبلت فنکار کی جبلت سے میل کھاتی ہے وہ اس کی تخلیق کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں۔ اہلیانِ لکھنو ایک ارتقاء پذیر ذہنی اور فکری عمل سے دو چار تھے علم و دانش کی باریکیوں اور جلوہ آرائیوں پر مادی لذات کے اندھیرے چھائے ہوئے تھے۔ ان کے لیے میر کی بولی جس کو میر ''زبان دہلوی'' کہتے تھے بہت کافی تھی۔ فن کی باریکیاں جانچنے کی نہ ان میں صلاحیت تھی اور نہ ضرورت انہیں جو کچھ ملا وہ ان کے مزاج کے عین مطابق تھا۔

دلی سے زباں دانی کی ٹکر لینے میں بھی لکھنو والوں نے دانش مندی سے کام نہیں لیا اور نہایت جلدی بازی سے میر امن کی باغ و بہار (۱۵-۱۲۱۶ھ/۱۸۰۱ء) کے جواب میں تقریباً چوبیس سال بعد رجب علی بیگ سرور سے فسانہ عجائب (۱۲۴۰ھ/۱۸۲۵ء) لکھوا ڈالی جس کی قلم کاری چند صفحات کے بعد دم توڑ گئی۔ کہانی میں ایک بی ڈھنگا شہزادہ در آیا طوائف ان کے سماج کی ایک ضرورت تھی اس لئے وہ بھی آ پہنچی۔ ہندو دیو مالا کی اوہام پرستی سے بھی مدد لی گئی۔ انگریز برابر میں بیٹھا تھا وہ بھی آ کودا۔ اس بے ترتیب نوزائیدہ سماج میں ذہنی، فکری اور علمی صلاحیتوں کو اتنی پختگی حاصل نہ ہوسکی تھی کہ علم و فن میں بڑے کارنامے سرانجام دیئے جا سکتے جب میر کی وفات کے پندرہ برس کے بعد نثری کاوش کا یہ معیار ہے تو ان کی لکھنو آمد کے وقت صنف نظم میں علمی اور فنی لیاقت کی پسماندگی کا کیا حال ہوگا زباں و بیاں، علم و ادب کی افراتفری اور ذہنی انتشار کو محسوس کرتے ہوئے ناسخ (۱۱۹۲ھ/۱۷۷۱ء) کو آگے چل کر اصلاح زبان کی ضرورت محسوس ہوئی اور انشاء نے بھی ادھر توجہ کی جب کہ دبستان دہلی اپنے فطری عمل کے تحت کام کرتا رہا۔

انسان فنا پذیر ہے اور کائنات تغیر پذیر۔ پچاس برس کے اندر ایک سیاسی، سماجی، تہذیبی، تمدنی اور ثقافتی انقلاب غیر محسوس طور پر برپا ہو جاتا ہے۔ پرانی طرز زندگی، روایات، حد یہ ہے کہ انسانی اطوار و عادات تبدیل ہو جاتی ہیں۔ نئی نسل کی سوچ پرانی نسل

کی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتی ان کے آپس کے خیالات میں تضاد ہو جاتا ہے۔ پچاس برس پہلے جو مرغوب تھا وہ پچاس سال بعد معتوب ہو جاتا ہے۔ اس تغیر کا اثر کسی قوم کے ادب پر بھی پڑتا ہے۔ ولؔی نے اپنے وقت میں دہلی کو اردو شاعری پر آمادہ کیا بہت دھوم مچی لیکن میؔر اپنے زمانے میں ولؔی کے لیے فرماتے ہیں ''وے شاعر یست از شیطان مشہور تر'' جس کا کمترؔین نے بہت خوب جواب دیا ''ولی پر جو سخن لائے اسے شیطان کہتے ہیں''۔ اٹھارہویں صدی کے عندلیباں دہلی کی نغمہ سرائیاں خلائے بسیط میں سفر کر رہی ہیں۔ سوسوا سو برس کی بات ہے میر امؔن، غالؔب، سرسؔید، حالؔی وغیرہ کا اب جزوی طور پر ذکر باقی ہے اور ہماری بدنصیبی کی آخری حد یہ ہے کہ قوم کے فرزند اقبال کے مزار پر بھی صرف فاتحہ ہی پڑھی جاتی ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر تخلیق اپنے زمانے کی ضروریات، احتیاجات اور تقاضوں سے رشتہ و پیوند رکھتی ہے لیکن وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ قانون فطرت کے تحت زمانہ کے بدلنے کے باعث لوگوں کے مذاق بھی بدل جاتے اور ماضی کی کارگذاریاں اپنی اہمیت کھو دیتی ہیں۔ میر کا کلام اپنے دور میں کسی طبقہ کو پسند آسکتا تھا لیکن آج کے دور میں ان کے پڑھنے والوں کی لیاقت، قابلیت ذہنی اور فکری صلاحیتیں میؔر کے دور کے کم رتبہ اور محدود تصورات سے کہیں زیادہ وسیع اور بلند ہیں اس لیے ہم کو پیشہ ور تخلیق کاروں کی تخلیقات کو ان کے دور کے سیاق و سباق میں دیکھنا چاہیے۔ بلاوجہ ان کو مسلط نہیں کرنا چاہئے میؔر کی صدہا غزلوں اور اشعار میں سے چند مخصوص غزلیں اور اشعار ہی آج تک زبانوں پر جاری ہیں۔

محمد حسین آزاد کی آبِ حیات قدیم تذکروں سے اہم ترین تصنیف ہے جس نے پہلی بار تاریخ۔ تذکرہ۔ تنقید اور تحقیق کو اردو زبان میں رائج کیا۔ وہ میر کے بہت معتقد ہیں۔ ان کی وساطت سے میر سوؔز اور میر تقی میؔر کا موازنہ اچھا رہے گا۔ اور میر تقی میؔر کی شخصیت اور فن پر ان کی رائے مستند اور معتبر تسلیم کی جائے گی۔ سب سے پہلے ان کی اس روایت کو لینا چاہیئے جس میں انھوں نے کہا کہ، ''لکھنو میں کسی نے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون

کون ہے؟ کہا ایک تو سوؔدا اور دوسرا یہ خاکسار اور کچھ تامل کر کے کہا آدھے خواجہ میر درد، مذہبی تعصب نے سوؔدا اور میؔر کو پورا شاعر بنایا، خواجہ میر درد کو آدھا اور میؔر سوز، نواب آصف الدولہ کے استاد ہونے کی وجہ سے پاؤ شاعر مانے گئے۔ میر پرستی کے جوش میں یہ یاد نہیں رہا کہ میؔر خود خواجہ میر درد کے بارے میں کیا لکھتے ہیں۔

''المتخلص بہ درد۔ جوشـــش بہار گلستان سخن۔ عندلیب خواں چمن این فن زبان گفتگو پیش گرہ کشائے زلف شام مدعا مصرع نوشتہ اش برصفحہ کاغذاز کاکل صبح کوچہ خوشنما۔ طبع سخن پرواز اور سو مائل چمنستان انداز است ۔ گاہے در باغ تلاش بہ طریق گل گشت قدم رنجہ می فرماید۔ در چمن شعرش لفظ رنگیں چمن سمن ۔، گل چین خیال اور اگل معنی دامن دامن۔ شاعر زور آور''(۳۷)

کوئی شخص بولا کہ حضرت اور میر سوؔز صاحب۔ چیں بہ چیں ہو کر کہا میر سوز صاحب بھی شاعر ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آخر استاد نواب آصف الدولہ کے ہیں، کہا خیر یہ ہے تو پونے تین سہی۔ مگر شرفا میں ایسے تخلص ہم نے نہیں سنے''۔ اب محمد حسین آزاد اپنی رائے دیتے ہیں، ''میر صاحب کے سامنے مجال کس کی تھی جو کہے ان بے چارے نے میر تخلص کیا تھا وہ آپ نے چھین لیا۔ ناچار اب انھوں نے ایسا تخلص اختیار کیا کہ نہ آپ کو پسند آئے نہ اپ اسے چھینیں''۔(۳۸) اس میں کوئی شک نہیں کہ میر تقی میؔر نے فن شاعری کے مسلمہ آداب کو نظر انداز کر کے نہایت سینہ زوری سے میر سوؔز کے اختیار کئے ہوئے تخلص پر قبضہ کیا۔ میر سوؔز نے اپنی شریف النفسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے، دوسرا تخلص اختیار کر لیا۔ کیونکہ ان کو اندیشہ تھا کہ یکساں تخلص کے باعث ان کی اپنی شخصیت اور کلام پر منفی اثرات پڑیں گے۔ محمد حسین آزاد نے کھل کر لکھا ہے ''غزلوں کے دیوان اگر چہ رطب و یابس سے بھرے ہوئے ہیں مگر جو ان میں انتخاب ہیں وہ فصاحت کے عالم میں انتخاب ہیں''۔ اردو زبان کے جوہری قدیم سے

---

(۳۷) نکات سخن صفحہ ۵۰۔
(۳۸) آب حیات۔ شیخ اینڈ سنز اردو بازار لاہور، صفحہ ۳۰۸۔

کہتے آئے ہیں ستر اور دو بہتر نشتر میں۔ باقی میرؔ صاحب کا تبرک ہے ''رطب ویا بس کو تبرک قرار دینے کے بعد ستر اور بہتر کی گنتی کو وسعت دیتے ہوئے کہتے ہیں'' لیکن یہ بہتر کی رقم فرضی ہے کیونکہ جب کوئی تڑپتا ہوا شعر پڑھا جاتا ہے تو ہر سخن شناس سے مبالغہ تعریف میں یہی سنا جاتا ہے کہ دیکھئے! یہ انہیں بہتر نشتروں میں سے ہے جانب داری کی ٹھوکر کھا کر مزید لکھتے ہیں ''انھوں نے زباں اور خیالات میں جس قدر فصاحت اور صفائی پیدا کی ہے اتنا ہی بلاغت کو کم کیا ہے یہی سبب ہے کہ اصول غزلیت کے لحاظ میں سوؔدا سے بہتر ہے ان کا صاف اور سمجھا ہوا کلام اپنی سادگی میں ایک انداز دکھاتا ہے اور فکر کو بجائے کاہش کے لذت بخشتا ہے اسی واسطے خواص میں معزز اور عوام میں ہر دل عزیز ہے۔ آگے چل کر محمد حسین آزاؔد بہت وضاحت سے نہایت کام کی باتیں بتاتے ہیں ''حقیقت میں یہ انداز میر سوؔز سے لیا۔ مگر ان کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں انھوں نے ان میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کو متانت کا رنگ دے کر محفل کے قابل بنایا''۔ (۳۹)

اپنی خود پرستی اور شوریدہ سری کے باعث دہلی کے اس مشہور و مقبول شاعر کے تخلص پر قبضہ کر لیا جس کو وہ اس وقت سے اختیار کئے ہوئے تھا جب میر تقی میرؔ کی عمر صرف نو دس سال تھی۔ خود فریبی اور خود ستائی کی انتہا ہے کہ میر تقی میرؔ تیئیس سال کی عمر میں اعلان کرتے ہیں کہ ان کی شہرت دہلی میں ہر طرف پھیل گئی تھی۔ ان کی ''بڑھتی ہوئی شہرت کے مہلک نتائج'' سے بچنے کی ایک ہی صورت تھی کہ سید محمد میرؔ سابقہ تخلص ترک کر کے سوؔز اختیار کر لیں اور میر تقی میرؔ کے ''کمالات شاعری'' کی زد سے نکل جائیں جس کی بابت سعادت یار خان ناصر نے بھی صاف طور پر لکھا ہے ''اول میرؔ تخلص کرتے تھے جب محمد تقی میرؔ کی شہرت ہوئی میرؔ قدیم نے سوؔز تخلص کیا الزام کس وناکس اس مرد آزاد نے اپنے سر نہ لیا''۔ (۴۰) بیس بائیس سال ایک تخلص سے مشہور ہونے کے باوجود میر سوؔز نے نہایت متانت اور سنجیدگی سے میر تقی میرؔ کی جنگ آزما فطرت سے خود کو محفوظ کر لیا۔

---

(۳۹) آب حیات۔ شیخ اینڈ سنز اردو بازار لاہور، صفحہ۔ ۱۹۸
(۴۰) خوش معرکہ زیبا، صفحہ۔ ۱۲۳۔ ۱۲۴۔

میر تقی میرؔ نے محمد حسین آزاد کے بقول میر سوؔز کے انداز سخن پر بھی اپنی سخنوری کی داغ بیل ڈالی جس میں وہ اپنی جامد اور فکر نارسا کے باعث کامیاب نہ ہو سکے محمد حسین آزاد کا کہنا ہے کہ میر سوؔز کے ہاں فقط باتیں ہی باتیں تھیں انھوں نے اس میں مضمون داخل کیا اور گھریلو زبان کا رنگ دے کر محفل کے قابل بنایا۔

۱۔ کلیات میرؔ کی سرسری طور پر ورق گردانی کرنے کے بعد مضمون اور متانت کا رنگ اور محفل کے قابل بنانے کا کمال کچھ اس طرح نظر آتا ہے۔

چھیڑیں نہ مجھ خاطر افسردہ کو ۱۳۰ مردہ ہلکا جھانٹ اکھاڑے سے نہ ہو
آخر عدم نے ''مونہ اکھاڑا'' مرا میاں ۳۶۰ مجھ کو تھا دست غیب پکڑ لی تری کمر
سوتا تھا بے خبر تو، نشہ میں جو رات کو ۳۶۰ سو بار میرؔ نے تری اٹھ اٹھ کے لی خبر
صحبت سے اس جہاں کی کوئی کم خلاص ہوگا ۳۹۵ اس فاحشہ پہ سب کو امساک ہوگیا ہے

خوجے سے اپنے کر لے قیاس ریش کجا ''خایہ'' کجا ائے غلام
سمجھے نہ سمجھے مرے ''خایہ'' سے ۴۶۴ میں نے تو نظیر اس کی کہی السلام

اس قطعہ کے آخری اشعار نقل کر کے تحریر کو نجس کرنا مناسب نہیں سمجھا صرف دو شعر بہ اکراہ لکھے گئے ہیں۔

۲۔ ہندو امراء کی صحبتوں اور کافرانہ ماحول کا یہ اثر ہوا کہ مذہبی عقائد اور تصورات بھی دریدہ ذہنی کی زد میں آگئے۔ مندروں میں دیوی دیوتاؤں کو دیکھتے دیکھتے ''مالک روز جزا'' ایک نہ رہا۔

تم بھی اے مالکان روز جزاء ۳۲۵ بخش دو اور گناہ مت پوچھو
اس بت کا ہر ایک تئیں ذکر ہے ۴۴۱ خدا کو خدائی کی اب فکر ہے
مستی میں چھوڑ دیر کو، کعبہ چلا تھا میں ۲۰۰ لغزش بڑی ہوئی تھی ولیکن سنبھل گیا

مجھے زنہار خوش آتا نہیں کعبہ کا ہمسایہ ۲۱۲ یہاں اے شیخ بت خانہ ہی تو نے کیوں نہ بنوایا
معمور شرابوں سے کبابوں سے ہے سب دیر۲۰۴ مسجد میں ہے کیا شیخ پیالہ نہ نوالا
شیخ کیا صورتیں رہتی تھیں بھلا جب تھا دیر۲۱۲ روبہ ویرانی ہو اس کعبہ کی ویرانی کا

۳۔ پیغمبروں کا گستاخانہ ذکر۔ تلمیحات کا غلط استعمال

آئی نظر جو گور سلیمان کی ایک روز کوچہ میں اس مزار کے یہ تھا رقم ہوا
کاے سرکشاں جہان میں کھینچا تھا ہم بھی سر۱۸۵ پایان کار مور کا خاک قدم ہوا
ادریس و خضر و عیسیٰ قاتل سے ہم چھڑائے ۱۹۰ ان خوں گرفتاں پر احسان ہے ہمارا
نہ اک یعقوب رویا اس الم میں ۲۹۲ کنواں اندھا ہوا یوسف کے غم میں
باہر نہ آتا چاہ سے یوسف جو جانتا ۲۲۳ لے کارواں مرے تئیں بازار جائے گا

۴۔ معلوم نہیں مذہبی شخصیات سے نفرت کیوں ہے کہ شعائر اسلامی کی تضحیک اس طرح کرتے ہیں کہ خود ان کی گندی ذہنیت سامنے آجاتی ہے۔

شیخ بے نفس کو نزلہ نہیں ہے، ناک کی راہ ۳۸۴ ہے یہ جریان منی دہات چلی جاتی ہے
شتلب کیا کرے ہے یہ کتیا کی۔۔۔ سے ۱۴۰ داڑھی منڈانے بیٹھے تو کتے کی موت سے
میں داڑھی تری واعظ مسجد میں ہی منڈواتا ۲۲۴ پر کیا کروں ساتھ اپنے حجام نہیں رکھتا
کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے، تب کیا تھا شیخ ۳۵۰ ہم حرم میں بھی رہے تو ترے داماد رہے
شیخ مت روکش ہو مستوں کا تو اس جبۂ اپر ۲۶۹ لینے استنجا کا ڈھیلا تیری ٹل جاتی ہے ناف
کچھ کم نہیں ہیں شعبدہ بازوں سے مے گسار ۱۸۶ دارو پلا کے شیخ کو آدم سے خر کیا
شیخ قلاش ہے جوئے میں نہ لاؤ ۱۸۹ یاں ہمارا رہے ہے مال پڑا
شور قلقل کی ہوتی تھی مانع ۲۱۴ ریش قاضی پہ رات میں تھوکا
بہکے جو ہم مست آگئے، سو بار مسجد سے اٹھا ۲۱۲ واعظ کو مارے خوف کے کل لگ گیا جلاب سا

۵۔ بے سروپا لایعنی باتیں

گئی ہوتی سر آبلوں کے ہوئی خیر ۲۱۶ بڑا قضیہ خاروں سے برپا ہوا تھا
داں وہ تو گھر سے اپنے پی کر شراب نکلا یاں شرم سے عرق میں ڈوب آفتاب نکلا
پردے ہی میں چلا جا خورشید، تو ہے بہتر اک حشر ہے جو گھر سے وہ بے حجاب نکلا
کچھ دیر ہی نہ لاگی دل کی تو تیر لگتے اس صید ناتواں کا کیا جی شتاب نکلا
ہر حرف غم نے میرے مجلس کے تئیں رلایا ۳۰ گویا غبار دل کا پڑھتا کتاب نکلا

مجنوں کے مرید، چچا اور نہایت بے حیائی سے شیخ کے داماد اور فرہاد کے استاد ہیں۔

گور مجنوں سے نہ جاویں حشر تک ہم بے نوا ۱۹۸ عیب ہے ہم میں جو چھوڑیں ڈھیر اپنے پیر کا
خوف ہم کو نہیں جنوں سے کچھ ۲۲۷ یوں تو مجنوں کے بھی چچا ہیں ہم
میرے سنگ مزار پر فرہاد ۲۴۸ رکھ کے تیشہ کہے ہے یا استاد
کچھ بھی نسبت نہ تھی جب دیر سے، تب کیا تھا شیخ ۳۵۰ ہم حرم میں بھی رہے تو ترے داماد رہے
احوال اس شکار زبوں کا ہے جائے رحم ۲۲۰ جس ناتواں کو مفت نہ قصاب لے گیا

۶۔ غیر حقیقی، غیر منطقی اور مہمل خیالات

دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو وہ یہ کہے ہے ۲۶۲ ہوتا ہے قتل کیوں کر یہ بے گناہ دیکھوں
فائدہ مصر میں یوسف رہے زندان کے بیچ ۲۴۴ بھیج دے کیوں نہ زلیخا اسے کنعان کے بیچ
تری گلی میں، میں رویا تھا دل جلا یک شب ۲۸۹ ہنوز واں سے دل داغدار پاتے ہیں
تڑپ ہے قیس کے دل میں تہ زمیں اس سے ۲۸۵ غزال دشت نشان مزار پاتے ہیں

اگرچہ حامیانِ میرؔ نے بیسویں صدی میں طبع ہونے والی کلیات میر سے متروک الفاظ کو جدید تلفظ اور املا سے لکھا ہے پھر بھی ہر جگہ تصحیح کا اہتمام نہ ہوسکا ہے۔ ہم نے اکبر حیدری صاحب کے مرتب کردہ دیوان کو بنیاد بنایا ہے جس میں میرؔ کی اصلی بولی ملتی ہے۔ اس قسم کی بولی بولنا اور اس کو اردوئے معلیٰ یا زبان دہلوی کہہ کر اترانا مضحکہ خیز ضرور ہے۔

گفتگو ریختہ میں ہم سے نہ کر یہ ہماری زبان ہے پیارے

بے شک یہ میرؔ کی اپنی بولی ہے۔ اردوئے معلیٰ یا زبان دہلوی نہیں۔

۱۔ آنکھ‌لڑنا ۲۔ اُور ۳۔ آوَتا ۴۔ آوَتی ۵۔ ایکوں
۶۔ باؤ ۷۔ بکانا ۸۔ بچن ۹۔ پون ۱۰۔ پچھتاؤنا
۱۱۔ دل‌ٹھگنا ۱۲۔ دیہی ۱۳۔ ڈبا ۱۴۔ ستاؤنے ۱۵۔ سووتی
۱۶۔ کاہے ۱۷۔ کانپوں ۱۸۔ کنہوں ۱۹۔ کنہیں ۲۰۔ نراس

آنکھ لڑی اس کی ایک جاگہ ۸۱ بے خود ہو گئی جانِ آ گہہ
جو ہو میرؔ بھی اس گلی میں صبا ۳۵۹ بہت پوچھیو تو مری اور سے
بھول جائے غم بتاں میں جی ۲۴۸ آوَتا ہے غرض خدا ہی یاد
کیا ہے یہ جو آوَتی ہے گا ہے آندھی کوئی زرد ۲۴۹ یا بگولا جو کوئی سر کھینچے ہی صحرا نورد
رسم قلمروئے عشق مت پوچھ کہ ناحق ۱۸۹ ایکوں کی کھال کھینچی ایکوں کو دار کھینچا
نہ موئے ہم اسیری میں تو نسیم ۲۲۰ کوئی دن اور باؤ کھائیے گا
خواہاں نہیں وہ کیوں ہے، وہ اپنی طرف سے یوں ۱۸۰ دل دے کے اپنے ہاتھ بکایا تو کیا ہوا
کل بارے ہم سے ان کی ملاقات ہوگئی ۹۶ دو دو بچن کے ہونے میں اک بات ہوگئی
افسوس میرے مردے پر اتنا نہ کر کہ اب ۲۰۳ پچھتاؤ نا عبث ہے جو ہونا تھا ہو چکا
اے بوئے گل سمجھ کے مہکیو پون کے بیچ ۲۴۶ زخمی پڑے ہیں مرغ ہزاروں چمن کے بیچ
ایک صاحب سے دل لگا میرا ۸۰ ان کے عشووں نے دل ٹھگا میرا
اتنی سڈول دیہی (۴۱) دیکھی نہ ہم سنی ہے ۲۰۹ ترکیب اس کی گویا سانچے میں گئی ہے ڈھالی
نہیں گزرتی گھڑی کوئی مجھ خراب پہ آہ ۱۸۲ کہ جس میں غم سے ترے جی ڈبا نہیں جاتا
عدم میں ہم کو یہ غم رہے گا کہ اوروں پر اب ستم رہے گا ۳۳۱ تمہیں تولت ہے ستاؤنے کی کسو پہ آخر جفا کروگے
کن نیندوں سووَتی ہے تو اے چشم گریہ ناک ۲۲۰ مژگاں کو کھول شہر کو سیلاب لے گیا
ہونا تھا مجلس آرا گر غیر کا تجھے تو ۱۹۵ مانند شمع مجھ کو کاہے (۴۲) تیئں جلایا

(۴۱) جسم۔ بدن
(۴۲) خالص شمالی ہند کا دیہاتی لفظ ہے بمعنی کیوں

اس واسطے کانپوں ہوں کہ ہے باؤ پنٹ سرو ۳۳۷ یہ باؤ کلیجہ کے کہیں پار نہ ہووے
جواب نامہ سیاہی کا اپنی ہے وہ زلف ۲۳۱ کنہوں نے حشر کو ہم سے اگر سوال کیا
لباس دیکھ لیے میں نے تیری پوشش کے ۲۲۶ کہ بعد مرگ کنہیں نے مجھے کفن نہ دیا
تجھ سے کیا کیا توقعیں تھیں ہمیں ۲۲۱ سو ترے ظلم نے نراس کیا

عیب تنافر کی بھرمار۔

۱۔ تاتن کے تیئں ۲۔ توتوبہ‌توڑا ۳۔ توتوبہ ۴۔ توتو
۵۔ جی جو ۶۔ شب سے سو ۷۔ چوپڑا ۸۔ کوکا

عریاں تنی شوخی وحشت بھی کوئی بلا تھی ۲۷۸ تہہ گرد کی نہ بیٹھی تاتن کے تیئں چھپاؤں
ساقی تو ایک بار تو توبہ توڑا مری ۱۷۷ توبہ کروں جو پھر تو توبہ ہزار بار
زلفیں کھولیں تو تو ٹک آیا نظر ۱۵۵ عمر بھر یاں کام دل برہم رہا
گل نے ہر چند کہا باغ میں رہ پر اس بن ۲۵۱ جی جو اچٹا تو کسی طرح لگایا نہ گیا
دھڑکا تھا دل چیدن شب سے سو آج ۲۵۱ دیکھا وہی کہ آنسوؤں میں چوپڑا جگر
رات پیاسا تھا میرے لوہو کا ۲۱۴ ہوں دوانہ تیرے سگ کوکا

غیر شاعرانہ الفاظ

۱۔ جھاڑ وٹوکرا ۲۔ چپ کا ۳۔ دھتورا ۴۔ سگ وآہو ۵۔ کڑوڑ

جھاڑو ٹوکرا لے ہر صبح آوَ تا ہے ۱۹۵ جاروب کش مگر ہے خورشید ان کے ہاں کا
سخن کے طول سے آزردہ ہوتے ہیں سامع ۱۳۹ یہ کہہ کے مطلع ثانی رہوں گا میں چپ کا
مُل چشم نے نگہ سے دھتورا دیا مجھے ۲۲۵ خس بھر نہ چھڑا دل کو میں تنکے چنا کیا
عاشق میں ہے اور اس میں نسبت سگ و آہو کی جوں جوں وہ رمیدہ ہو توں توں وہ لگا جاوے
طالع سفید دیکھ کے دولت نہ ہوئی نصیب ۲۱۵ سر پر مرے کڑوڑ برس تک ہما پھرا

بول چال میں حروف روابط کی عدم موجودگی

چا کر سینہ دل میں پھینک دیا ۲۲۹ کھینچے ایذا ہمیشہ میر بلا

دل میں نے پھینک دیا کہنا چاہتے ہیں مگر اب معنی یہ ہوئے کہ سینہ کو چاک کر کے دل کے اندر پھینک دیا۔

الٰہی وہ بھی دن ہوگا کہ جس میں ایک ساعت بھی ۲۱٦ میں روؤں گا وہ اپنے ہاتھ میرے منہ کو دھوئے گا

الفاظ کا بغیر سوچے سمجھے استعمال

گلہ سن پیچشِ کا کل کا مجھ سے یوں لگا کہنے ۳۴۴ تو اپنی فصد کر جلدی کہ تجھ کو میرؔ سودا ہے

ہر صبح دم کروں ہوں الحاح اور انابت ۲۴۳ تو بھی مری دعا سے ملتی نہیں اجابت

اگر اگتے رہے اے نا امیدی داغ ایسے ہی ۲۱٦ تو کا ہے کو کوئی تخم تمنا دل میں بوئے گا

پہلا مصرع فارسی توالی اضافت دوسرا مصرع ہندی ثقیل غیر شاعرانہ الفاظ کا حامل

کریں ہیں دعویٰ خوش آہواں دشت ۲۰۱ ٹک ایک دیکھنا چل ملک ان گنواروں کا

قوافی کے غیر موزونی

کیا مرے آنے یہ تو اے بت مغرور گیا ۱۸۱ کبھو اس راہ سے نکلا تو تجھے گھور گیا

گور سے نالے نہیں اٹھتے تو نے اگتی ہے جی گیا پر نہ ہمارا دل پر شور گیا

مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلوں میں میر تقی میرؔ اپنے معاصرین سے پیچھے رہ جاتے ہیں مضمون آفرینی تو بہت دور کی بات ہے وہ اپنے اسلوب کو بھی بھول جاتے ہیں اور فکر کی کم مائیگی اور الفاظ کی کھینچا تانی باقی رہ جاتی ہے۔

شعراء کے تقابلی باب میں ان کے معاصرین کی طرحی غزلوں کے درمیان میرؔ کی غزلیں پھیکی، بے اثر اور تھکی ہاری معلوم ہوتی ہیں اس کی تصدیق محمد حسین آزاد کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے۔

"(۴۳) مگر بزرگوں سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ مشاعرہ یا فرمائش کی غزلیں ایسی نہ ہوتی تھیں جیسی کہ اپنی طبع زاد طرح میں ہوتی تھیں۔"

دونوں شاعروں کی دو طرحی غزلیں مزید نقل کی جاتی ہیں۔ یہاں بھی وہ دیگر غزلوں کی مانند میر سوز کی انگلی پکڑ کر ڈگمگا ڈگمگا کر چلتے نظر آتے ہیں۔

سوز۔صفحہ ۱۸٦	میر۔صفحہ ۱۹۸
اس سروقد کی دوستی میں کچھ ثمر نہیں	دامن پہ تیرے گرد کا کیوں کر اثر نہیں
نخل محبت آہ مرا بارور نہیں	ہم دل جلوں کی خاک جہاں میں کدھر نہیں
اس سنگدل کو حال پہ آیا نہ میرے رحم	اتنا رقیب خانہ بر انداز سے سلوک
اے آہ و نالہ حیف کہ تم میں اثر نہیں	جب آؤتے ہیں ہم تو سنے ہیں کہ گھر نہیں
یا قوت، لعل یار سے بہتر نہیں ولے	خون جگر تو کچھ نہ رہا تو ہی سب رہا
ہر جوہری کو اس کی پرکھ کی نظر نہیں	بس اے سرشک، آنکھیں تری کیا مگر نہیں
کیوں مجھ سے بے گناہ کو ناحق کرے ہے قتل	داماں و جیب و دیدہ و مژگاں و آستیں
اے یار تیرے دل میں خدا کا بھی ڈر نہیں	اب کون سا رہا ہے کہ ان میں سے تر نہیں
قاصد کی کیا مجال کہ اس کو، میں جاسکے	ہر نقش پا ہے شوخ ترا رشک یاسمن
جز مرغ روح کوئی مرا نامہ بر نہیں	کم گوشہ چمن سے ترا رہگذر نہیں
میری طرف سے دیجو صبا گل کو یہ پیام	کیوں الاماں کرے ہے دل شب گھڑی گھڑی
آوں قفس بھی توڑ کے، تو بال و پر نہیں	برچھی لگاتی آہ ہماری اگر نہیں
ہر گز نہ مان سوزؔ تو واعظ کی گفتگو	آتا ہے تیرے کوچے میں ہوتا جو میرؔ یاں
ذرہ بھی اس کو اصل سخن کی خبر نہیں	کیا جانیئے کدھر کو گیا کچھ خبر نہیں
صفحہ۔۲۰۱	صفحہ۔۲۷۰
مرضی جو آئی چرخ کی بے داد کی طرف	غالب ہے تیرے عہد میں بیداد کی طرف
مائل کیئے دل اس ستم ایجاد کی طرف	ہر خوں گرفتہ جائے ہے جلاد کی طرف
تصویر بن کے آپ ہی حیران رہ گیا	کس نے کہا ہے تم سے مچلکہ کی داد دو
بیٹھا جو منہ کو پھیر کے بہزاد کی طرف	ٹک کان بھی رکھا کرو فریاد کی طرف
دیکھے جو ایک آن تری سرو خوش خرام	ہر تار زلف قیمت فردوس ہے ترا

قمری نہ دیکھے پھر کبھو شمشاد کی طرف کرتا ہے کون طرہ شمشاد کی طرف
بھاوے نہ گل چمن میں کبھی تجھ کو عندلیب جانا نہ پر فشانی کو ہم اور جو ایک بار
دیکھے جو آ کے تو مرے صیاد کی طرف پرواز کی چمن سے سو صیاد کی طرف
حرمت خدا ہی دین کی رکھے آج بخت سے حیراں کا رعشق ہے شیریں کا نقش میر
جاتا ہے شیخ سوز سے استاد کی طرف کچھ یوں ہی دیکھتا نہیں فرہاد کی طرف

اردو زبان اب بین الاقوامی زبان بنتی جا رہی ہے۔ دنیا کے مختلف ملکوں کی جامعات میں اس کی تدریس کے انتظامات بھی ہیں اور اردو ادب کو دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے بدقسمتی سے ہمارے قومی مزاج میں اختلاف رائے توازن اور اعتدال کے ساتھ نہیں ملتا۔ ہم زندگی کے ہر شعبہ میں اصولی بنیادوں پر پسند اور ناپسند کا اظہار نہیں کرتے ہیں بلکہ ذات، برادری اور مسلک کے پیش نظر تنقید اور تحسین کرتے ہیں یہ رجحان قدیم زمانے سے لے کر آج تک، خاص طور سے طبقہ شعراء میں شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ جہاں تک میؔر کے فضائل کا تعلق ہے وہ رائج الوقت فارسی زبان لکھ پڑھ سکتے تھے۔ دیگر علوم وفنون سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا سوائے فن شاعری کے کہ اسی پر ان کی گذر بسر کا دارومدار تھا۔ کم معاشی اور کم آمیزی کے باعث ان کی فکر و دانش میں ایک قسم کا انجماد رہا۔

اب اگر کوئی طبقہ غیر واجبی احترام اور عقیدت کے باعث خلاف واقعہ تحسین و آفرین کرے تو ممدوح کی بھی توقیر میں اضافہ نہیں ہوتا اور معتقدین کی فہم وفراست پر بھی حرف آتا ہے۔ جہاں تک میر سوؔز کا تعلق ہے، وہ اپنے حسب نسب، علم وفضل اور ذاتی اوصاف کے سبب سے میر تقی میؔر پر برتری رکھتے ہیں انھوں نے اپنے عقیدت مندوں کے ذریعہ کوئی ''جتھابندی'' نہیں کی۔ اور نہ فن شعر کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنانے کی تشہیر کی۔ ان کا ذریعہ معاش فن شاعری تک محدود نہ تھا۔ وہ فن شاعری کے علاوہ فن سپہ گری اور فنِ خوش نویسی میں طاق اور شہرہ آفاق تھے اور ان فنون سے کسب معاش کر سکتے تھے۔

پرانے لوگ جو کچھ کر گئے اور کہہ گئے وہ اپنے دور کے ساتھ ختم ہوگیا۔ موجودہ زمانہ واقعیت اور اصلیت جاننے کا دور ہے۔ ہر مسئلہ کو جانچنے اور پرکھنے کا رجحان ہے۔ لہٰذا ہم کو اردو ادب میں جہاں جہاں کوتاہیاں اور لغزشیں ہوئی ہیں ان کی اصلیت کو واضح کرنا چاہیے اور جو ہستی جیسی ہے اس کو اسی کے صحیح خدوخال میں پیش کرنا چاہیے۔ جھوٹی حکایتیں اور غیر واجب ستائیش کرنے والے غیر معتبر سمجھے جاتے ہیں اور قومی علمی وادبی ورثہ پر غیر مستند ہونے کا داغ لگ جاتا ہے۔

☆☆☆